بیڑہ، جس کے ہاتھ میں ہے وہ آگے بڑھے گا۔

س: اب تک فیض صاحب کے فن و شخصیت پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں بطور فیض کی صاحبزادی آپ کو ان کی شخصیت پر لکھی گئی کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند آئی؟

ج: یہ کہنا بہت مشکل ہے، میرے خیال میں جو واقعی اچھی کتاب ہونی چاہئے وہ ابھی لکھی نہیں گئی۔ اور وہ اس لیے کہ میں دو لوگوں کے پیچھے لگی ہوئی ہوں۔ ایک تو میں زہرہ آپا کے پیچھے لگی ہوئی ہوں کیونکہ انھوں نے ابو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے اسیری کے ایام پھر جب وہ خود ساختہ جلاوطنی کے دور سے گزر رہے تھے، ملک سے دور تھے اور دیس بدر تھے۔ جو زہرہ آپا نے ابو کی اُداسیاں دیکھیں، ایک تو وہ اور پھر چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ان کو یاد ہیں تو اور ان کے حافظے میں بہت ساری ایسی باتیں بھی ہیں جن میں بہت مزاحیہ پہلو بھی نکلتے ہیں۔ تو ایک تو میں ان کے پیچھے لگی ہوئی ہوں وہ ضرور لکھیں۔ دوسرے آئی اے رحمٰن صاحب جو، ابا کے بہت دوست لیکن ابا سے بہت چھوٹے تھے لیکن اُبا ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کی بہت عزت کرتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ ابا جب کہیں باہر کے دورے سے واپس گھر آتے تو اماں سے کہتے کہ بھئی فلاں فلاں چیز ہوئی ہے۔ اس چیز کا پس منظر پتہ نہیں کیا ہے؟ میں فلاں مسئلے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، چلو رحمٰن سے پوچھتے ہیں تو مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اگرچہ ابا تو خود اتنی سمجھ رکھتے تھے لیکن رحمٰن صاحب کے خیالات، ان کے علم اور جس طرح سے وہ کسی چیز کے بارے میں تجزیہ کرتے تھے، ابا ان کی بہت عزت کرتے تھے اور میرے خیال میں رحمٰن صاحب کی بھی ان سے قربت تھی۔ اس کے کئی پہلو تھے۔ فلم میں دونوں کی بہت دلچسپی تھی اور ظاہر ہے کہ ''پاکستان ٹائمز'' میں اکٹھے تھے، دونوں کے خیالات اور نظریات بھی آپس میں بہت ملتے تھے۔



فیض احمد فیض اور زہرا نگاہ

س: ویسے تو فیض صاحب کا سارا کلام ہی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہم جاننا چاہیں گے کہ فیض صاحب کے کن اشعار کا شمار آپ کے پسندیدہ اشعار میں ہوتا ہے؟

ج: میری پسند کے جو شعر ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں۔ظاہر ہے کبھی آپ کے اندر کسی چیز کا درد ہوتا ہے، کبھی کسی چیز کی اُمید ہوتی ہے۔کبھی کسی چیز کی الجھن ہوتی ہے یا غصہ آ رہا ہوتا ہے تو پھر اکثر انسان اپنے دوست سے ہی تبادلۂ خیال کرتا ہے تو میں نے یا شعیب سے بات کی یا پھر ''نسخہ ہائے وفا'' سے بات کی۔ان حالات میں جن سے ہم گزر رہے ہوتے ہیں، تو میں کہتی ہوں کہ دعا ہی کرنا چاہئے۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

س: آپ نے فیض صاحب کے ساتھ ایک طویل بحری سفر بھی کیا جب وہ ''لینن پیس پرائز'' وصول کرنے ماسکو گئے تھے۔اس تاریخی سفر کے یادگار لمحات جو آج بھی آپ کی سنہری یادوں کا سرمایہ ہیں؟

ج: پہلی مرتبہ ابا کے ساتھ اتنا وقت گزارا اورنیشنل کالج آف آرٹس سے میں نکلی تھی اور انگلستان پڑھنے جا رہی تھی اور اتفاق سے اس زمانے میں ابا کو ''لینن پیس پرائز'' لینے جانا تھا، اس سے پہلے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہوائی جہاز میں مت جائیں۔اس زمانے میں بحری جہاز چلتے تھے کراچی سے۔ایک وہ بھی زمانے تھے ابا جب بھی ملک چھوڑتے تھے تو صدر یا وزیر اعظم جو بھی بادشاہ ہوتا تھا، پاکستان کا اس سے اجازت لیتے تھے تحریری طور پر کیونکہ کئی مرتبہ ان کو آخری لمحے جہاز سے اتار دیا جاتا تھا یا سرحد پر روک دیا جاتا تھا۔اسی باعث انھوں نے جنرل ایوب خان سے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا اور ہم



فیض احمد فیض اور پابلو نرودا

کراچی پہنچے اور انھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کوتوالِ شہر یعنی آئی جی سے بھی پوچھ لیا تھا کہ بھئی کل ہم بحری جہاز پکڑ رہے ہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟ نہیں جی کوئی مسئلہ نہیں آپ جایئے۔ آپ کے پاس جنرل ایوب خان کا خط ہے۔ ہم جہاز پر پہنچے پاسپورٹ دکھایا، مجھے تو انھوں نے باعزت بری کر دیا۔ ابا کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور کاغذات اِدھر سے دیکھ رہے ہیں، اُدھر سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر ابا نے خط دکھایا کہ بھائی بادشاہ سلامت سے اجازت ملی ہے پھر بھی انھوں نے ایک گھنٹے بٹھائے رکھا۔ آخر کار ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔ چونکہ جہاز رات کو چلنا تھا ہم پہلے اپنے کیبن میں گئے۔ پھر ابا نے کہا چلو چل کر کھانا کھاتے ہیں تو اس سے پہلے کہ ہم جاتے ،دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ دروازہ کھولا ۔ دو منحوس صورتیں سامنے کہ جی ذرا پاسپورٹ دکھایئے۔ ابا نے ناراض ہو کر پاسپورٹ نکال کر دکھایا۔ اب پھر وہ پاسپورٹ کو الٹا سیدھا کر کے دیکھ رہے ہیں۔ ابا نے خط بھی دکھا دیا۔ بڑی بددلی سے پاسپورٹ واپس کیا پھر چلے گئے تو ابا تھوڑا سا پریشان ہو گئے ۔انھوں نے مجھے فوراً بٹھا کر کہا کہ دیکھو اگر مجھے یہ جہاز سے اُتار دیتے ہیں تو تم نے اکیلے جانا ہے۔ تمہاری ماں کو میں بھیج دوں گا۔ وہ تمہیں رُوم میں مل جائیں گی کیونکہ جہاز اٹلی جا رہا تھا اور تم وہاں سے ان کے ساتھ چلی جانا ماسکو اور تم وصول کرنا ''دلینن پیس پرائز'' انہوں نے سارے ٹریولرز چیکس سائن کیے اور مجھے پکڑا دیے۔ اچھا میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ میں تو کبھی گھر سے اس طرح باہر نہیں گئی تھی تو بہت میں نے ضبط کر کے اور دل کو مضبوط کر سوچا کہ الٰہی خیر۔ پھر ہم کھانا کھانے چلے گئے ۔ ڈائننگ روم میں بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ بھئی ابا تو بڑے اطمینان سے کھانا کھا رہے ہیں۔ میرے حلق میں نوالہ پھنس رہا ہے ۔ پھر بحری جہاز میں اعلان ہوا کہ Mr. Faiz Ahmad Faiz gose to the captain's office تو میں نے کہا کہ بیڑہ غرق ہو گیا۔ اس کے بعد ابا گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔ میں نے دیکھا ان کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا، میں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگے پھر پاسپورٹ مانگ رہے تھے تو میں نے کہا آپ وارنٹ لے کر آؤ تو پھر میں پاسپورٹ دوں گا۔ اس سے پہلے نہیں دوں گا۔ خیر وہ تو مزے سے کھانا کھاتے رہے۔ مجھ سے کھانا نہ کھایا گیا۔ وہاں سے اُٹھ کر ہم بیٹھے لاؤنج میں کافی پینے، اور میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ دونوں منحوس صورتیں پھر آگے پیچھے گھوم رہی تھیں۔ ابا کو میں نے کچھ نہیں بتایا کہ میں کیا دیکھ رہی ہوں لیکن کچھ دیر کے بعد وہ غائب ہو گئے اور اس کے ہم کیبن میں گئے۔ ابھی جہاز چلا نہیں تھا تو ابا نے آرام سے Sleeping Suit پہنا اور بیڈ پر لیٹ گئے اور میں اسی طرح سے اکڑوں بیٹھی ہوں کہ پتا نہیں اب کیا ہو جائے مگر ابا کوئی پرواہ نہیں، وہ مزے سے کتاب پڑھ رہے ہیں ۔ اس کے بعد پھر جہاز کا سائرن بجا اور آہستہ آہستہ جہاز سرکنا شروع ہوا اور کراچی کی روشنیاں دور نظر ہونے لگیں۔ ابا ہم جا رہے ہیں۔ ابا کہنے لگے ہاں سو جاؤ تو پورا سفر اسی طرح سے گزرا۔ ابا بھی کم گو میں بھی کم گو۔ ہم پڑھتے رہے۔ ان کی جرابیں اور بنیان میں ضرور دھوتی۔ مجھے خیال آیا کہ



میری اماں ان کا کتنا خیال رکھتی ہیں کیونکہ ابا کو اپنے کام خود کرنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ ہر چیز میری اماں کرتی تھیں ۔تین ہفتے بحری سفر کے اور اس کے بعد پھر ٹرین کا تین دن کا سفر، روم سے ماسکو کا تھا۔ پھر جب ''سوچی'' میں ان کو سینی ٹوریم میں بھیجا گیا آرام کرنے۔ وہاں ''پابلو نرودا'' اور ان کی بیگم سے بھی ملے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ وہ سب ایک خواب تھا اور بڑے اہم ادیبوں سے اس زمانے میں ملاقات ہوئی، اور پھر ابا نے جس طرح سے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے اپنی تقریر لکھی لینن ایوارڈ کی تقریب میں اظہارِ خیال کرنے کے لیے۔ اُس وقت وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے اور لکھ رہے تھے۔ وہ نقشِ ماضی کبھی آتے ہیں، کبھی مٹ جاتے ہیں اور آج کل میں یادداشتیں لکھ رہی ہوں بلکہ ریکارڈ کر رہی ہوں کیونکہ لکھنا تو ایک مصیبت ہے۔ ایک سستی سی ہے، انگریزی میں بول رہی ہوں، بعد میں ترجمہ بھی ہو جائے گا۔ جولین ایک فرانسیسی محقق ہیں جو اردو میں لکھتے ہیں وہ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے، ان کے ساتھ مل کر اس طریقے سے کہ وہ مجھ سے سوال پوچھتے ہیں میں ان کے جوابات ریکارڈ کرتی ہوں۔ وہ بہت عمدہ لکھتے اور سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ بھی اتنا ہے کہ کبھی کبھی میں کوئی واقعہ یا نام بھی بھولتی ہوں تو وہ مجھے فیض صاحب کے کئی واقعات بھی یاد دلا دیتے ہیں۔ اب دیکھیں عمر رہی تو چھپ بھی جائے گی۔

س: معروف ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر سے بھی تو فیض صاحب کی بہت دوستی رہی، اس زمانے میں فیض صاحب کی جن دیگر ادبی شخصیات کے ساتھ نشستیں رہیں اس کے حوالے سے کچھ یادیں بانٹنا پسند کریں گی؟

ج: سجاد ظہیر جن کو ہم بنّے چچا کہتے تھے وہ ابا کے ساتھ حیدر آباد جیل میں تھے، ان کا خاندان یہاں نہیں تھا بلکہ وہ ہندوستان میں تھا تو منیزہ میری بہن ''میزو'' ہم ایک طرح سے ان کی بیٹیاں تھیں۔ میری امی ہمیشہ کہتی تھیں



فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر

کہ ابو کو خط لکھو تو بنّے چچا کو بھی لکھو اور انہوں نے ہماری ڈیوٹی لگائی ہوتی تھی کہ ان کو خط بھی لکھنا ہے۔ ایک دفعہ ہم عید پر پہنچے تھے حیدر آباد جیل تو میرے خیال میں بنّے چچا کو سب سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد کی کمی محسوس ہوئی تھی لیکن میری اماں نے اور ہم دونوں نے ان کو محسوس ہونے نہیں دیا۔ ''میزو'' ان کی گود میں اُچک کر بیٹھ جاتی تھی اور ضد کرتی تھی ٹافی کے لیے اور بنّے چچا کے ساتھ جو قربت تھی وہ اس لیے تھی کیونکہ وہ بہت محسوس کرتی تھی کہ جیسے وہ بالکل میرے ابو بنے ہوئے ہیں اور پھر اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں ملاقات ہوئی جب ابا اور ہم لوگ ہندوستان گئے۔ وہاں پر ایشئین رائٹرز کانفرنس ہوئی، پھر میری بنّے چچا سے ملاقات ہوئی لیکن افسوس وہ میری اُن سے آخری ملاقات ثابت ہوئی لیکن ابا ان سے ملتے رہے تھے، ماسکو میں، تاشقند میں بلکہ دونوں اکٹھے تھے ''الماتے'' میں جب بنّے چچا کا انتقال ہوا۔ ابا پھر ان کے جنازے کو ''دلّی'' لے کر گئے تھے اور یوں دوستی کا حق ادا کیا۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جیسے پطرس بخاری، جن کے ساتھ ہماری بالکل ایسے دوستی تھی، محسوس ہوتے تھے کہ میری عمر کے ہیں وہ۔ انھوں نے دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا جب ابا جیل میں تھے جب کبھی پطرس بخاری اقوام متحدہ سے آتے تھے تو ہمارے گھر پہنچتے تھے اور سب سے پہلے پوچھتے تھے۔ اچھا کیا چیز چاہئے سالگرہ کے لیے؟ میں کہتی کہ میری سالگرہ تو بہت دور ہے۔ نہیں مگر چاہئے کیا تو پھر میں بتاتی تھی میری جو بھی خواہش ہوتی تھی اور پھر وہ چیز آجاتی تھی۔ اسی طرح سے میری جو خالہ تھیں جب ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہوا اور وہ بیوہ ہو گئیں تو ان کے بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح محبت و شفقت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیٹی مریم سے کہنے لگے اچھا تمہیں کیا چاہئے؟ کہنے لگی مجھے تو سائیکل چاہئے تو سائیکل آ گئی۔ سو ایسے دوست تھے میرے خیال میں جنہوں نے بہت بہت ساتھ دیا، وہ بھولتے نہیں۔ راجندر سنگھ بیدی جن کو میں پہلی مرتبہ ملی تھی۔ جب ہم لوگ دلی گئے تھے جب رائٹرز کانفرنس ہوئی تھی تو انھوں نے مجھے اور ''میزو'' کو دیکھ کر کہا تھا تم لوگوں کو آئس کریم پسند ہے؟ ہم نے کہا بہت۔ تو وہ فوراً ہمارے اماں ابا کو چھوڑ کر ہمیں لے گئے آئس کریم کھلانے اور انھوں نے کہا کہ ایک ایک آئسکریم کوئی نہیں کھائے گا کم سے کم تین کھائیں گے جس پر ہم نے بعد میں بہت ڈانٹ کھائی اپنی اماں سے لیکن ہم نے تین تین آئس کریم ضرور ہڑپ کر لیں۔

س: کوئی آخری بات جو آپ ریڈیو پاکستان کے مائیکروفون کے ذریعے سامعین سے براہِ راست کرنا چاہیں گی؟

ج: آخری بات تو میں کروں گی ان لوگوں سے، جن سے مجھے بہت پیار ہے اور وہ ہیں پاکستان کے نوجوان۔ میں ان سے کہوں گی کہ میرے جیسے بزرگوں کی بات نہ سنیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں۔ آپ وہ کریں جو آپ کے من میں آئے اور انشاءاللہ آپ کا مستقبل بہت روشن ہے۔ آپ بہتر جانتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے



فیض امن میلہ کے موقع پر شبانہ اعظمی کے ہمراہ

شکیل عادل زادہ

اسکول کا زمانہ تھا، میں پانچویں جماعت میں تھا اور جب بھی اگلی گلی میں دادا ابو (ظفر حسن مرحوم) کے گھر جانا ہوتا تو اکثر ان کو رات کے وقت بستر پر لیٹے ہوئے ایک رسالہ پڑھنے میں مشغول پاتا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ رسالہ ہمارے ابو (پرویز حسن مرحوم) لے آتے اور پھر جب وہ پڑھ لیتے تو وہ رسالہ پھپھو (رضیہ سیف خان) کے گھر پہنچ جاتا۔ اچھا اس زمانے میں بہت سے ادبی رسائل و جرائد ہمارے ہاں آتے تھے لیکن یہ واحد رسالہ تھا جس کا سفر ایک گھرانے سے دوسرے گھرانے تک اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ اس رسالے کا اگلا شمارہ نہ آجاتا۔ وقت گزرتا گیا، تعلیم کے مدارج طے ہوتے گئے جب خود بہاول پور کے معروف شاہی بازار میں کتابوں و اخبارات کی قدیم دوکان ''کیپٹل نیوز ایجنسی'' جانا شروع کیا تو وہاں بھی کبھی سات ماہ، کبھی ایک سال اور کبھی چار ماہ کے بعد ایک بورڈ آویزاں ہوتا کہ ''سب رنگ'' کا شمارہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرا لیجئے اور یوں معلوم ہوا کہ اس رسالے کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے اور وہ ایک سوغات کی طرح فروخت ہوتا ہے۔ پھر جب ہمیں مطالعہ کی لت پڑی تو معلوم ہوا کہ اس رسالے کے مدیر شکیل عادل زادہ ہیں جن کے نام میں بھی ایک طرح کی انفرادیت اور نغمگیت ہے۔ بہرحال یہ واحد رسالہ تھا جس کی تعریف ہمیشہ اپنے ابو سے سنی اور ان کو اس رسالہ کا ہمیشہ منتظر پایا جو میرے لیے ''سب رنگ'' کی ہمیشہ کشش کا باعث بنا اور جب میں نے ''سب رنگ'' کے پرانے شماروں کا مطالعہ کیا تو مجھے شکیل عادل زادہ ہمیشہ ایک افسانوی، اساطیری اور پراسرار شخصیت محسوس ہوئے جو نہ جانے کہاں کہاں سے اس دور میں جب دنیا ابھی فیس بک، موبائل فون، واٹس ایپ، گوگل اور وکی پیڈیا کے نام سے بھی آشنا نہیں ہوئی تھی، اس زمانے میں ''سب رنگ'' میں چھپنے والا ایک ایک حرف اور لفظ خود بولتا تھا کہ اردو ادب میں حرف و لفظ کی حرمت اور آبرو کی اہمیت کیا ہے اور وہ دہکتی آرزوؤں، دھڑکتی چلمنوں کے قصے، لہکتے آنچلوں کے افسانے، داستاں در داستاں، اردو کی دل ساز، نقش طراز کہانیاں، بہکتی نگاہوں کے قصے، لفظوں اور لکیروں کے خواب، اپنی نسرینِ ناز آفرین کے لیے تمام تر شیشۂ احساس، عجز و انکسار سے بطور ایک نازکش و نیاز کیش کس طرح پیش کرتے ہیں۔ وقت گزرتا رہا اور ''سب رنگ'' کی اشاعت میں تعطّل پیدا ہوتا گیا۔ ادھر شکیل عادل زادہ کی شخصیت میں پراسراریت بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ معروف محقق اور شاعر عقیل عباس جعفری سے (جنہیں میں عقیل بھائی کہتا ہوں) دورانِ گفتگو شکیل عادل زادہ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کوئی مسئلہ نہیں جب بھی کراچی آؤ گے، ملوا دیں گے اور پھر رواں سال کے پہلے ماہ کے آخری ہفتے میں اچانک کراچی جانے کا پروگرام بنا تو عقیل بھائی سے رابطہ کیا انہوں نے شکیل عادل زادہ صاحب سے رابطہ کر کے ہمیں بتایا کہ کہ آپ کی ملاقات طے ہوگئی ہے اور یوں ہم ایک شام شکیل عادل زادہ کے دولت کدے پر عقیل عباس جعفری صاحب، اپنے بھائی فواد اور عم زاد سعد شاہد کے ہمراہ ان کی نرم گرم گفتگو، پرخلوص انداز مہربانی اور شفقت سے فیض یاب ہوئے۔



اس گفتگو کے دوران ہمیں بالکل محسوس نہیں ہوا کہ ہم اردو اب کی انتہائی قد آور شخصیت کے سامنے بیٹھے ہیں جن کے رسالے میں صرف ایک کہانی شائع کروانے کے لیے پاکستان و ہندوستان کے کتنے سرکردہ قلم کار اور کہانی کار کیا کیا جتن کرتے ہوں گے؟ آیئے شکیل بھائی کے ساتھ گفتگو میں آپ کو شریک کرتے ہیں۔



س: شکیل بھائی سب سے پہلے تو آپ یہ فرمایئے کہ آپ نے کیسے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ہندوستان کے کس علاقے سے آپ کا تعلق تھا۔

ج: ہم مڈل کلاس گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابا خاندان سے ذرا مختلف تھے۔ آپ انہیں صحافی بھی کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ وہ مراد آباد سے ایک ماہنامہ رسالہ نکالتے تھے ''مسافر'' جس کے لیے وہ رئیس امروہوی صاحب کو بحیثیت مدیر امروہہ سے لائے تھے۔ امروہہ مراد آباد سے ۲۰ میل دور ہے تو ابا کا نام اس رسالے پر بطور مدیر مسئول اور رئیس صاحب کا نام بطور مسئول آتا تھا۔ ایک اور صاحب بھی تھے کوکب مراد آبادی ۔ یہ تینوں مل کر رسالہ نکالتے تھے۔ ان حضرات کی ایک تگڑم تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ سن ۴۴ء، ۴۵ء میں کاغذ نایاب ہو گیا تو ''مسافر'' کو بند کرنا پڑا۔ ابا اس سے اتنے اداس ہوئے کہ انھیں تپ دق ہو گئی اور وہ ایک ہی سال میں چل بسے۔ تو گویا میں نے ابا کو دیکھا ہوش میں مگر اس قدر زیادہ نہیں تو نانا نے ہمیں پالا وہ برتنوں کا کاروبار کرتے تھے۔ مراد آباد چار چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک تو پیتل کے برتنوں کی تجارت، دوسرا جگر مراد آبادی، تیسرا امروہہ اور چوتھا مراد آبادی تمباکو کی وجہ سے جو ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ تو بہر حال نانا نے ہمیں پالا۔ میٹرک کے بعد انہوں نے کہا کہ بیٹے اپنا کچھ کرو چونکہ ان کا کاروبار کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ان کا ایک کنسائنمنٹ چٹاگانگ میں پھنس گیا تھا جو ادا نہیں ہوا تو وہ اس سے خاصے متاثر ہوئے۔ میٹرک کے بعد اب انٹر میں جب داخلہ لیا تو میں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں بڑے ماموں جن کا اپنا کاروبار ختم ہو چکا تھا تو انھوں نے دوسرے لوگوں کے کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام شروع کر دیا۔ کمیشن ایجنٹ انھیں کہتے تھے کہ آپ مدراس، حیدر آباد وغیرہ جایئے یا کسی بھی شہر میں جا کر برتنوں کے نمونے دکھا کر آرڈر لیں تو اس آرڈر پر ان کا کمیشن بنتا تھا تو وہ کہنے لگے کہ تم میرے ساتھ چلو، ہمیں سیاحت کا بہت شوق تھا چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ جنوبی ہندوستان لے گئے۔ ہم کوئی ایک ڈیڑھ سال تک گھومتے رہے۔ اچھا وہ ریل میں تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر ہوتا تھا۔ اس دوران اپنا سامان بھی ہم خود ہی اٹھاتے تھے اور پھر خود ہی ریل میں رکھتے تھے اور مجھے بڑا شوق تھا گھومنے کا تو حیدر آباد میں کوئی آٹھ دس مہینے رہا۔ میں نے دیکھا کہ حیدر آباد دکن ایک علیحدہ تہذیب ہے جیسے لکھنؤ اور دہلی تو وہاں میرا دل بہت لگا۔ اس کے بعد پھر دل چاہا کہ میں پاکستان آ جاؤں لیکن میرے ساتھ آنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اس وقت میں پڑھ رہا تھا انٹرمیڈیٹ میں اور امتحان میں مہینہ باقی تھا۔ میں نے خاموشی سے پاسپورٹ وغیرہ بنوایا اور میں گھر سے بغیر کہے، گویا فرار ہو کر پاکستان آ گیا۔ جب اماں بہت روئی پیٹی تو تین چار مہینے بعد مجھے واپس جانا پڑا اور پھر ماموں جان مجھے دوبارہ اپنے ساتھ ہندوستان کے دورے پر لے گئے تو پھر ہم بہت گھومے۔ یہ غالباً سن ۵۵ء یا ۵۶ء کا زمانہ تھا، تو سیاحت کے ذریعے بہت موقع ملا گھومنے کا۔ اچھا اب سفر میں مزہ آتا ہی ہے بطور تھرڈ کلاس مسافر، چونکہ فرسٹ کلاس میں وہ چیزیں سامنے نہیں آتی جن سے آپ کو واسطہ پڑتا تھا تھرڈ کلاس میں۔



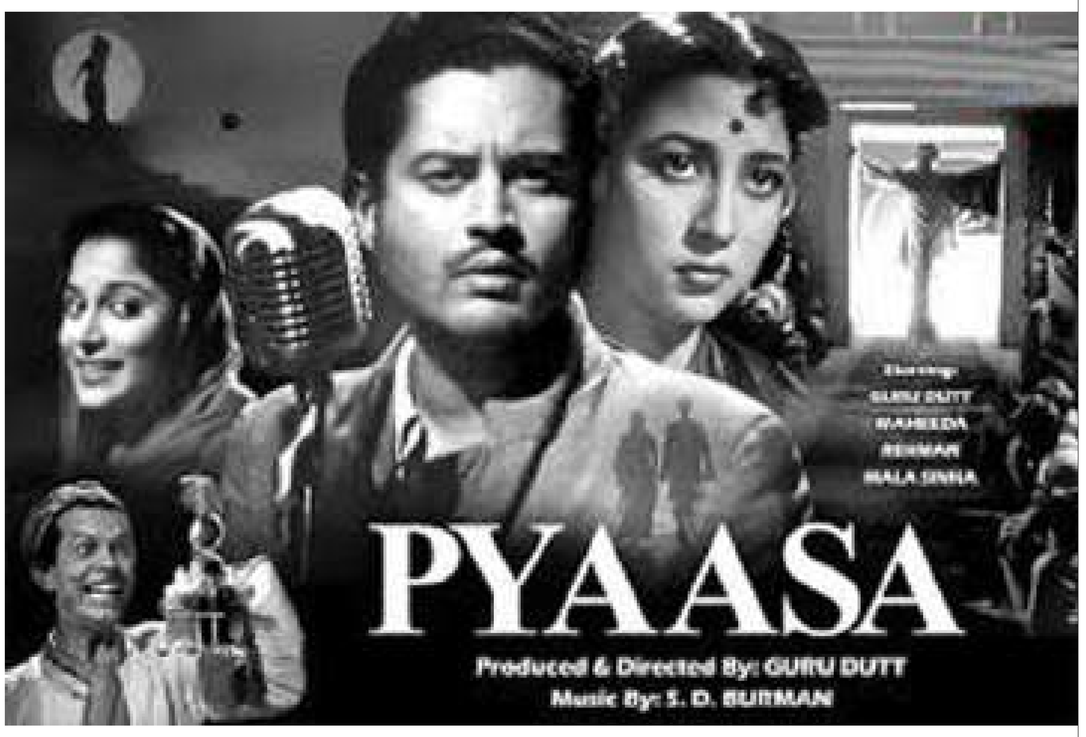
رئیس امروہوی (۱۹۴۵ء)

س: آپ نے بچپن میں ہی بے حد جہاں گردی کی۔کون سے علاقوں کی یاد آج بھی ستاتی ہے؟

ج: حیدر آباد دکن، شہر تو بہت اچھے ہیں، میسور اور بنگلور بہت کمال کے شہر ہیں۔ بنگلور بہت خوبصورت شہر ہے لیکن حیدر آباد دکن میں ایک تہذیب تھی اور وہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز اور بہت محبت کرنے والے تھے تو وہاں حیدر آباد مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔

س: سنا ہے آپ کو نوجوانی میں فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا اور وہ واقعہ بھی سنایئے جب آپ نے مشہور مزاحیہ اداکار جانی واکر کے ہاتھوں سے سگریٹ چھین کر پی۔

ج: ہمیں فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور کوئی فلم ایسی نہیں ہوتی تھی مراد آباد میں کہ پہلے دن ہی اس کا فرسٹ شو نہ دیکھ پائیں۔سب سے نچلے درجے کا ساڑھے پانچ آنے کا ٹکٹ ہوتا تھا وہ ہم کسی نہ کسی طرح بلیک سے خرید لیتے تھے چونکہ کھڑکی پر بہت ہجوم ہوتا تھا لوگ ایک دوسرے کے اوپر سے کودتے تھے اور وہاں سے ٹکٹ لینا بڑا مسئلہ تھا۔کہانیاں پڑھنا، رسالے پڑھنا اور فکشن سے شروع سے ہی لگاؤ تھا۔فکشن پڑھنے والے کو اگر سیاحت کا بھی ذوق ہو تو پھر وہ لکھنے لگتا ہے۔یہ حیدر آباد دکن کا واقعہ ہے ان دنوں گرودت کی فلم ''پیاسا'' کا بہت شہرہ تھا ریلیز سے پہلے ہی اس فلم کے چرچے شروع ہو گئے۔جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ فلم کا سارا یونٹ ریلیز کے موقع پر حیدر آباد دکن آنے والا ہے، میں ترکیبیں لڑانے لگا کہ اس افتتاحی شو کو کس طرح دیکھوں ۔اس شام حیدر آباد دکن کے پیلس سنیما میں قیامت کا ہجوم تھا جس کا سبب یہ تھا کہ فلم کی مکمل کاسٹ جن میں گرودت، وحیدہ رحمٰن، شکیلہ، جانی واکر اور ساحر لدھیانوی بھی سنیما گھر میں موجود تھے اور میں ٹکٹ لیے بغیر نہ صرف سنیما گھر میں داخل ہو گیا بلکہ کسی نہ کسی طریقے سے اسٹیج پر پہنچ گیا جہاں یہ سارے فلمی ستارے موجود تھے۔میں ان کے درمیان گھل مِل گیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اداکار مجھے سنیما کی انتظامیہ کا کوئی فرد سمجھ



رہے تھے اور سنیما والے مجھے فلم یونٹ کا رکن سمجھ رہے تھے اور ایک موقع ایسا آیا کہ میں نے اداکار جانی واکر کے ہاتھوں سے سگریٹ بھی چھین کر پی لی۔ بعد میں اس تقریب کی جو تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں ان میں میری تصاویر بھی شامل تھیں۔

س: شکیل بھائی! شکیلہ جمال سے آپ کا کیا تعلق تھا؟

ج: (ہنستے ہوئے) اس زمانے میں ہمیں اس بات کا شوق تھا کہ ہمارے گھر سب سے زیادہ ڈاک آئے۔ محلے کے کسی کے گھر میں ڈاک کا آنا ذرا باعث عزت سمجھا جاتا تھا اگرچہ ہمارے گھر ڈاک بہت آتی تھی۔ ہم گھڑی بنانے والے اداروں کو خط لکھتے تھے تو وہ گھڑیوں کی پبلسٹی کے لیے اپنے پمفلٹ وغیرہ بھیجتے تھے۔ اسی طرح معروف ادبی ماہنامے ''بیسویں صدی'' کی خوبی یہ تھی کہ اس رسالے میں چھپنے والے ادیب یا شاعر کا پتہ بھی اس کے اندر شامل ہوتا تھا تو ہم نے ان ادیبوں اور شعراء کو خط لکھنا شروع کیے تو کسی کا جواب آجاتا تھا، کسی کا نہیں۔ پھر ہمیں سوجھا کہ لڑکی کے نام سے خط لکھا جائے تو میں نے شکیلہ جمال کے نام سے خط لکھنا شروع کیے۔



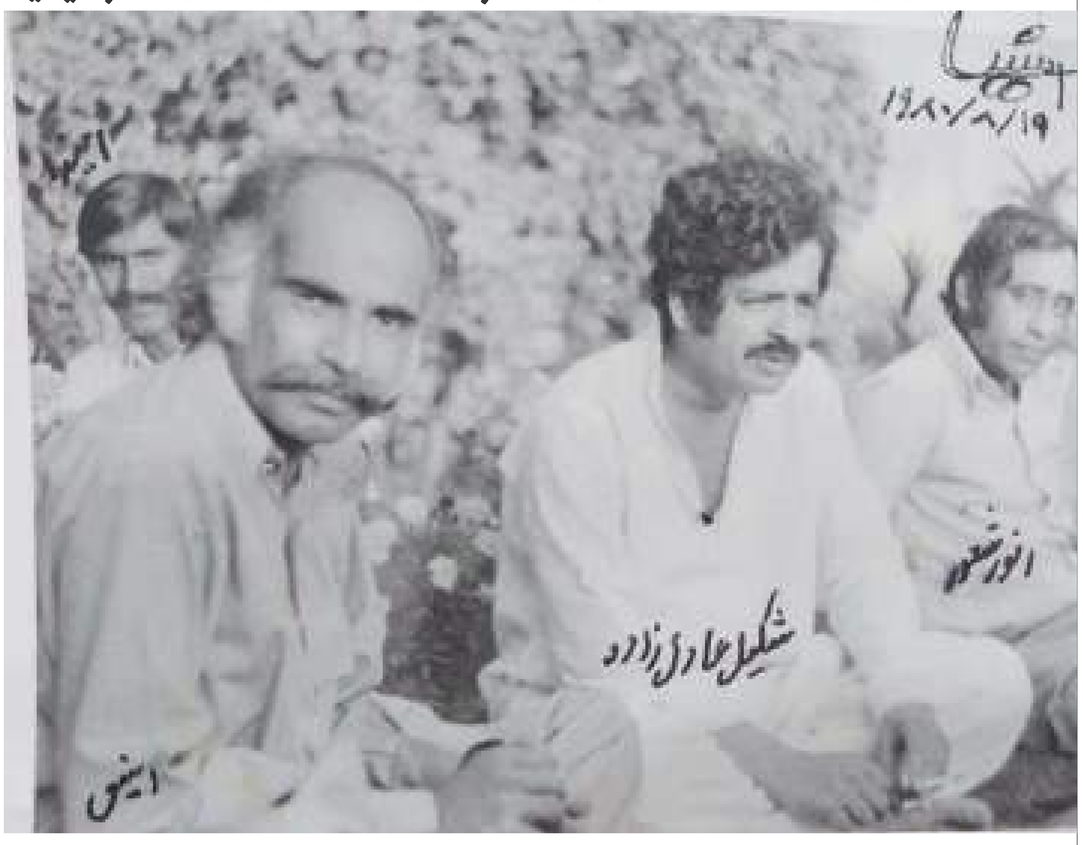
س: لیکن آپ نے شکیلہ جمال ہی نام اپنے لیے کیوں پسند کیا؟

ج: میں نے اپنے نام شکیل کو شکیلہ میں بدل لیا۔ شروع ہی سے ہمیں اپنا تخلص رکھنے کا بھی شوق تھا تو اس زمانے میں ہم نے اپنا تخلص جمال رکھا ہوا تھا شکیل جمال جس کو ہم نے شکیلہ جمال میں بدل لیا تو جب ہم نے لڑکی کے نام سے خط لکھے تو اس کا رسپانس بڑا شدید آیا کوئی ۹۰ فیصد سے اوپر۔ ہر جگہ سے خط کا جواب آرہا ہے اور جن سے میں چاہتا تھا کہ زیادہ خط و کتابت ہو ان کے خطوط مجھے بہت زیادہ آنے لگے۔

س: شکیلہ جمال کی حیثیت سے اپنے وقت کی کن کن اہم شخصیات سے آپ کی خط و کتابت رہی اور اس حوالے سے یقیناً کچھ دلچسپ واقعات بھی پیش آئے ہوں گے؟ اور یہ سلسلہ کیسے موقوف ہوا؟

ج: اس میں یہ ہوا کہ صرف شاعر یا ادیب نہیں دوسرے لوگ بھی تھے جو قلمی دوستی کے شوقین ہوتے ہیں نا۔ اس میں انبالہ کے ڈاکٹر گووندر کوچھڑ تھے، مطب تھا ان کا انبالے میں۔ وہ بھی عاشق ہو گئے تھے شکیلہ جمال پر اور ان کا عجیب واقعہ ہوا، وہ خط انگریزی میں لکھتے مجھے اور میں انھیں اردو میں لکھتا تھا کیونکہ انبالہ میں خوب اردو بولی اور پڑھی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں ہندوستان میں ہوائی سفر کر رہا تھا۔ ہوائی جہاز پر ایک صاحب میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟ تو کہنے لگے انبالہ سے۔ میں نے کہا انبالہ میں ایک صاحب ہوتے تھے ڈاکٹر گووندر کوچھڑ۔ کہنے لگے وہ میرے عزیز ہیں۔ میں نے کہا بھئی ان سے کہہ دینا کہ شکیلہ جمال کے بھائی ملے تھے جہاز میں، سلام کہا ہے۔ انہوں نے کہا ''بہت اچھا'' پھر دلّی کے نریش کمار شاد تھے جو ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں ''سرخ حاشیے'' کے عنوان سے لکھتے تھے تو وہ بہت متاثر ہو گئے۔ ان سے بھی بطور شکیلہ جمال خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک دن وہ دوپہر کو گھر چلے آئے۔

اتفاق سے میں گھر پر نہیں تھا۔ اماں کو یہ قصہ معلوم تھا کہ میں خط لکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ شکیلہ تو بریلی گئی ہوئی ہیں اور ان کے بھائی شکیل کالج گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا اچھا میں ریلوے اسٹیشن کے سیکنڈ کلاس کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ آئیں اگر ہو سکے تو مجھ سے مل لیں۔ خیر میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن گیا، وہ نہیں ملے۔ معلوم ہوا کہ گھر پہنچ گئے ہیں۔ وہ ادھر آتے، میں ادھر جاتا رہا۔ دن میں تین مرتبہ ایسا ہوا۔ محلے کے ایک صاحب تھے زاہد شمسی صاحب، انھیں معلوم تھا کہ میں یہ شرارت کرتا رہتا ہوں اور یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ انھوں نے جب محلے میں دیکھا کہ ایک صاحب شیروانی پہنے ہوئے ہاتھوں میں کتابوں کے بڑے تھیلے لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں تو شمسی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ بھئی کیوں گھوم رہے ہیں آپ گلی میں؟ کیونکہ چھوٹے شہروں میں اجنبی لوگ بہت آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ تو انھوں نے بتایا کہ میں شکیلہ جمال صاحبہ سے ملنے ان کے گھر آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کون سی شکیلہ؟ ارے وہ تو شکیل جمال ہے جو بہت خبیث لونڈا ہے۔ آپ کس چکر میں پڑ گئے؟ او بھئی وہ کوئی لڑکی نہیں ہے بس اس کے بعد وہ چلے گئے۔ اس طرح بہت سے واقعات ہوئے اور نریش کمار شاد صاحب کا بھی بعد میں انتقال ہو گیا۔ عجب عجب خیالات میرے ذہن میں آتے رہے، خطوط کا ایک پلندہ تھا۔ میری خط و کتابت شکیل بدایونی سے بہت اچھی رہی لیکن شکیل بدایونی سے شکیلہ جمال کے نام سے نہیں بلکہ اپنے نام سے رہی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہاں مراد آباد میں وہ ایک مشاعرہ میں آئے تھے، ہم نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ پھر میں نے جب انھیں خط لکھا تو انہوں نے اس کا جواب دیا۔ یوں



انور شعور، شکیل عادل زادہ اور انیس شاہ جیلانی (۱۹/اگست ۱۹۸۰ء)

ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ خط صادق آباد والے انیس شاہ جیلانی مرحوم کے پاس محفوظ رہا۔ اب ان کے بیٹے کے پاس ہے۔ انیس شاہ جیلانی نے کہا یہ مجھے دے دو۔ میں نے کہا لے لو۔ ہاں شکیل بدایونی نے کہا کہ یار یہ خط مجھے دکھائیں تو میں نے بنڈل بھیج دیا کچھ لوگوں کے خطوط کا۔ انھوں نے وہ موسیقار اعظم نوشاد صاحب کو دکھایا۔ نوشاد صاحب نے بھی لطف لیا اور کہنے لگے کہ ٹھیک ہے بہت ہوگیا مگر اب یہ سلسلہ بند کر دیا جائے تو بہتر ہے، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بعد میں شکیل صاحب اور نوشاد صاحب کے کہنے پر میں نے وہ سلسلہ بند کر دیا۔

س: اس زمانے میں محلے میں لائبریریاں بھی بہت ہوتی ہوں گی؟

ج: ایک آنہ لائبریری ہوتی تھی۔ اس میں جتنے بھی ناول تھے، وہ ہم نے بچپن میں ہی پڑھ لیے تھے، انتظار کرتے تھے کہ کوئی نیا ناول آئے تو پڑھیں۔

س: کس قسم کی کتابیں زیرِ مطالعہ رہتی تھیں؟

ج: سب کچھ شروع میں ہی پڑھ لیا تھا اور کوئی بھی رسالہ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں پڑھ لیتے تھے۔ ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' اور باقی رسالے لائبریری میں ہی پڑھتے تھے۔ وہ ہمارے گھر نہیں آتے تھے۔ اس زمانے میں بھی کتابوں کا شوق ذرا مہنگا ہی ہوتا تھا لہٰذا محلے کی لائبریریوں سے لے کر کتابیں پڑھتے تھے۔ اسلامی ناول بہت پڑھے۔ بھئی کتابیں پڑھنا ہوتی تھیں جو بھی مل جائیں، بس تحقیقی کتابیں نہیں پڑھیں۔ فکشن کا دور تھا تو اس میں قیسی رام پوری اور صادق سردھنوی جو بڑے نامور آدمی تھے، ان کی کتابیں پڑھیں۔ ایم حسرت پسند نہیں آتے تھے، معلوم نہیں کیوں؟ مگر پڑھا انھیں بھی۔

س: پاکستان آنے کے بعد آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کس پرچے سے کیا؟

ج: ہوا یہ کہ جب میں پاکستان آیا تو رئیس امروہوی صاحب ایک پرچہ نکالتے تھے روزنامہ ''شیراز'' اچھا وہ نکلتا نہیں تھا صرف ڈمی ہوتا تھا۔ اس میں چونکہ صرف اشتہارات ہوتے تھے۔ رئیس صاحب کی وجہ سے ریلوے، کے ڈی اے اور عدالتی اشتہارات وغیرہ ملتے رہتے تھے تو لطیف کلیم نام کے ایک صاحب تھے۔ تو وہ کہنے لگے کہ میں تو لندن جا رہا ہوں۔ اب رئیس صاحب اسے ایڈٹ آپ ہی کریں تو میں نے کہا رئیس صاحب سے کہ میں اب ''شیراز'' کو سنبھالتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کو مارکیٹ میں تو جانا ہی نہیں ہے صرف اس کو برقرار رکھنا ہے ڈیکلریشن زندہ رکھنے کے لیے ڈمی کے طور پر۔ اس مقصد کے لیے اخبار کی مہینے میں ۱۶ر ڈمیاں نکلنا لازم ہیں تو ہم نے ۱۶ پرچے نکالنے تھے ایک مہینے میں۔ اچھا ایک روپے فی کالم کتابت ہوتی تھی گویا سات روپے کی کتابت ہوتی تھی پورے اخبار کی۔ پھر ہم خبر نہیں چھاپتے تھے بالکل ضمیمہ کی طرح ہوتا تھا۔ ہم نے رئیس صاحب سے کہا کہ میرا نام بھی آنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اس کے دس پندرہ شمارے چھپتے تھے اس میں ہمارا نام بھی آجاتا تھا۔ ہم بہت خوش ہوتے تھے کہ نام چھپ رہا



ہے نا لیکن وقت ہمارا نام شکیل چھپتا تھا تو ''شیراز'' نکلتا رہا۔ پھر ایک دفعہ یہ ہوا کہ رئیس صاحب سے میں نے کہا کہ ۲۳ مارچ کا موقع تھا کہ ہمیں اشتہار نہیں ملے ''حبیب گروپ آف انڈسٹریز'' کے تو انھوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ اچھا اگر میں کوشش کروں۔ کہنے لگے کہ پھر ٹھیک ہے کرو تو میں نے کہا کہ آپ مجھے پھر کیا دیں گے؟ کہنے لگے ۵۰ فیصد تمہارا۔ میں مشہور آرکائیوسٹ لطف اللہ خان صاحب کے چھوٹے بھائی امان اللہ خان صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ جناب سب کو اشتہار مل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''شیراز'' کو کیوں نہیں مل رہا؟ کہنے لگے اس کو نہیں ملا۔ میں نے کہا ''نہیں'' تو انھوں نے فوراً دو اشتہار برائے دو صفحات جاری کر دیے۔ ۲ صفحات کا مطلب یہ تھا ایک ہزار روپے اور کمیشن کاٹ کر ہمارے بن جاتے تھے کوئی سوا چار سو روپے۔ تو جب پیسے بھی میں جلدی لے آیا اور میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ بھئی یہ ہیں پیسے اور لائیے میرا کمیشن۔ تو وہ مُکر گئے کہنے لگے میں نے تو نہیں کہا تھا لہٰذا میں نے اُسی وقت ''شیراز'' کو چھوڑ دیا۔ اسی عرصے میں یعنی فروری سن ۵۸ء میں جونؔ ایلیا صاحب کی بحالی اور آبادکاری کے لیے ایک رسالہ نکالا گیا تھا ''انشاء''۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ''انشاء'' میں کام کروں یوں میں ''انشاء'' میں آ گیا۔ ''شیراز'' کچھ عرصے تک نکلتا رہا اور پھر بند ہو گیا۔

س: آپ محمد شکیل سے شکیل عادل زادہ کیسے ہوئے؟

ج: اصل میں یہ میرا نام رکھا جون ایلیا صاحب نے۔ عادل ابا کا نام تھا تو اسی مناسبت سے انھوں نے ہمارا نام شکیل عادل زادہ کر دیا۔ ویسے ہم نے لکھنا شروع کر دیا تھا ۵۸ء سے۔ اور ''انشاء'' میں ہماری تخلیقات ''محمد شکیل'' کے نام سے چھپتی تھیں۔



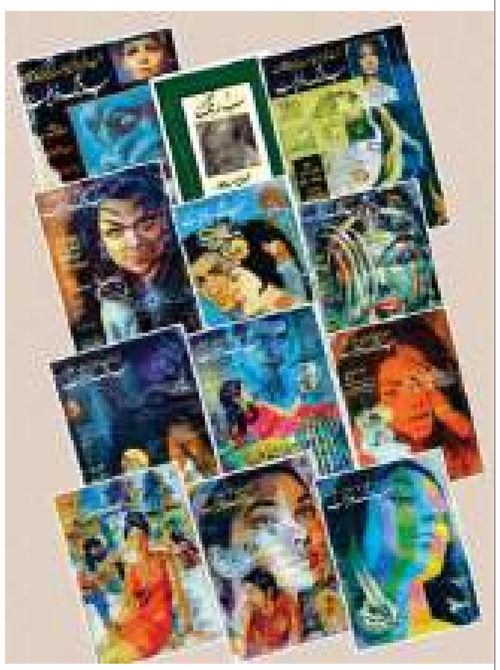
جون ایلیا، شکیل عادل زادہ اور سید محمد عباس (۱۹۶۳ء)

س: آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے معروف ادبی جریدے ''سب رنگ'' کی اشاعت نے ملکی تاریخ میں ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جو آج تک ناقابل تسخیر ہے۔ایک ماہ میں زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کہاں تک پہنچی تھی؟

ج: ''سب رنگ'' سے قبل پاکستان میں کسی بھی ماہنامہ رسالے کی اشاعت ایک لاکھ تک نہیں پہنچ پائی تھی پھر یہ اشاعت گئی ڈیڑھ لاکھ سے اوپر یعنی ایک لاکھ ۶۴ ہزار تک پہنچ گئی غالباً ماہانہ۔اچھا جب اتنی بڑی اشاعت تب ہوتی ہے جب ایک لاکھ تریسٹھ ہزار رسالہ بِک جاتا ہے۔چنانچہ اتنا پرچہ بِک جاتا تھا۔اچھا ہم پرچہ واپس بھی نہیں لیتے تھے۔ہم خود ہی کم بھیجتے تھے مثلاً کسی کا آرڈر ہے ایک سو کا تو ہم بھیجتے تھے اس کو اسّی۔ تاکہ پرچے کی ایک مانگ رہے۔

س: وہ کون سے عوامل تھے جن کی بناء پر ''سب رنگ'' اپنے معاصر جریدوں سے ہمیشہ منفرد و ممتاز نظر آیا؟

ج: سن ۷۷ء یا ۷۸ تک یہ باقاعدہ شائع ہوا ''سب رنگ'' کئی چیزوں سے ممتاز تھا۔وجہ کیا تھی کہ ''سب رنگ'' زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ایک تو تھا اس کا انتخاب جس میں ہم جی جان لگا دیتے تھے اور میں یہ کرتا تھا کہ جب کوئی ترجمہ شدہ کہانی ہمارے پاس آتی تھی تو ہم اسے اپنے دفتر کے سارے لوگوں کو اور پڑھے لکھے احباب مثلاً اسد بھائی (اسد محمد خان) سے پڑھواتے تھے اور اُن سے اس کہانی پر ان کی رائے تحریر میں نہیں، اعداد میں لیتے تھے، یعنی اگر کل ۱۰۰ نمبر ہیں تو اس کہانی کو ایک سو میں کتنے نمبر ملیں گے؟ اگر پچاس سے اوپر نمبر آتے تھے تو اس کہانی کو ہم قابلِ اشاعت سمجھتے تھے لیکن قابلِ اشاعت سمجھنے کے بعد اس پر کام ہوتا تھا مثلاً تمام ترجمہ نگار اوّل درجے کے مصنف نہیں ہوتے تھے تو ہم کبھی کبھی اس کہانی کو دوبارہ لکھواتے تھے اس میں انور شعور ہمارا بہت ہاتھ بٹاتے تھے۔بنیادی اصلاح کا کام انور شعور ہی کرتے تھے۔پھر پانچ آدمی پروف ریڈنگ کرتے تھے یہ تو تھا کہانی کے انتخاب کا مرحلہ۔دوسرا یہ تھا کہ پھر مرحلہ آتا پیشکش کے انداز کا، میں بہت سے رسالے دیکھتا رہتا تھا۔''سب رنگ'' کو ہم نے ''اردو ڈائجسٹ''، ''عالمی ڈائجسٹ'' اور دیگر شائع ہونے والے جرائد سے بہتر کرنے کی کوشش کی۔Elite والوں سے ٹائٹل چھپوایا جو مشکل کام تھا۔ اپنے وقت کے بڑے آرٹسٹ جو صرف واٹر کلر میں کام کرتے تھے منظور مرزا جنھوں نے قائداعظم کا آفیشل پورٹریٹ شیروانی والا بنایا، وہ تیار ہی نہیں ہوتے تھے، میں نے اُن سے بہت درخواست کی۔کہنے لگے دیکھو جناب میرا معاوضہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔میں نے کہا آپ جتنے کہیں گے تو انہوں نے بتائے، وہ میں نے پیش کر دیے۔اس کے کچھ عرصے کے بعد انھوں نے کہا شکیل اس معاوضے کو مزید بڑھا نہیں سکتے تو میں نے کہا بڑھا دیں گے اور بڑھا بھی دیے۔اچھا پھر ''سب رنگ'' کا معاوضہ دوسرے ڈائجسٹوں سے زیادہ ہوتا تھا۔



س: کتنا معاوضہ دیتے تھے آپ؟

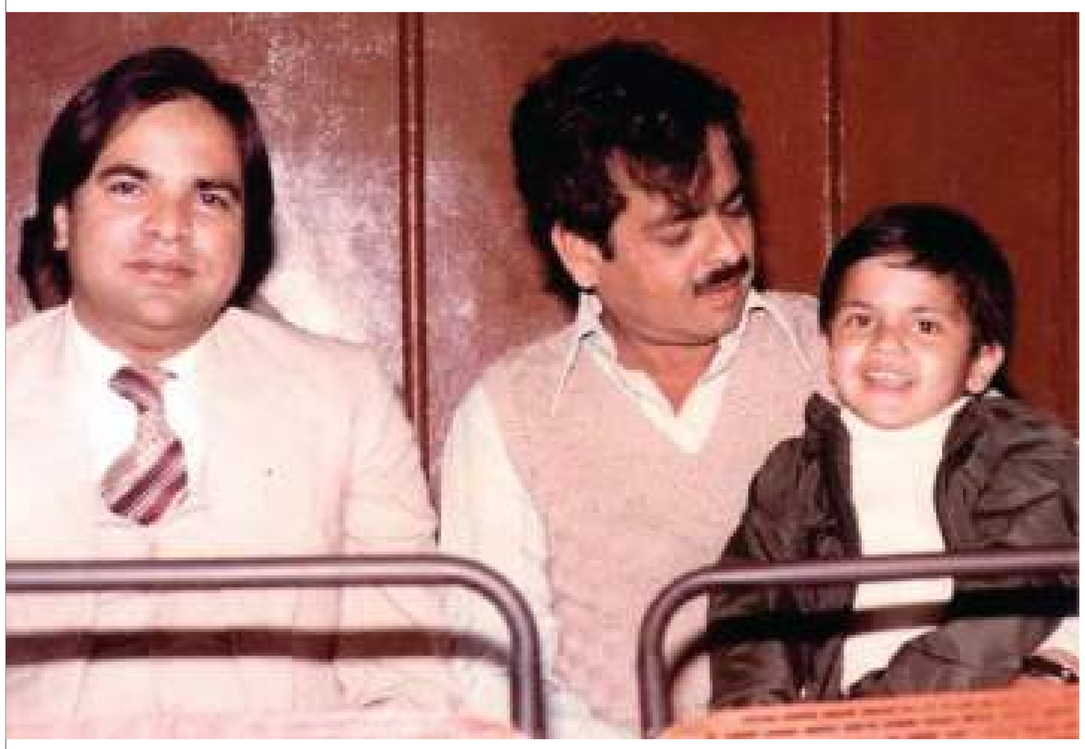
ج: دیکھیئے اس زمانے میں ''عالمی ڈائجسٹ'' والے ۲۵ روپے فی صفحہ دیتے تھے چار پانچ صفحوں کی کہانی کے، جس پر احمد صغیر صدیقی نے کہا تھا یہ زیادہ تو نہیں ہیں؟ ہم نے مختلف ادیبوں کے مختلف معاوضے مقرر کیے تھے۔ کسی کو ۱۰۰ روپے فی صفحہ دیتے تھے کسی کو ۵۰ روپے، پھر شوکت صدیقی کو ۳ ہزار روپے ''جانگلوس'' کی ایک قسط کے دیے۔ پندرہ صفحے کی بمشکل کہانی ہوتی تھی۔ سن ۸۰ء کی دہائی میں ''جانگلوس'' کا آغاز ہوا تھا تو یہ بھی ایک وجہ تھی اور ''سب رنگ'' کی پریذنٹیشن مختلف تھی۔ اچھا ایک تیسری بات یہ ہوتی تھی کہ ''سب رنگ'' کا مدیر ہر تحریر میں شامل نظر آئے۔ یہ بات مجھے کسی نے بتائی نہیں تھی اور نہ میں نے پڑھی تھی۔ جو کہانی چھپتی تھی اس کے نوٹس وغیرہ میں بہت توجہ سے لکھتا تھا اور بہت سے لوگوں سے پوچھتا تھا۔ اس زمانے میں گوگل وغیرہ تھا نہیں۔ کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مثلاً قاضی عبدالستار کے بارے میں جاننا کہ ان کی قابلیت کیا ہے؟ لیکن بہرحال ہم وہ معلومات حاصل کرتے تھے کسی نا کسی طریقے سے۔ ایک صاحب تھے، سید محمد اشرف انھوں نے لکھا تھا ''نمبردار کا نیلا'' وہ بمبئی میں رہتے تھے تو ان کے کوائف نہیں مل رہے تھے تو میں نے گلزار صاحب کو لکھا کہ بھئی ان کا فون نمبر کچھ معلوم ہو جائے۔ اب گلزار صاحب ٹھہرے معروف آدمی لیکن میری دوستی تھی ان سے انہوں نے پھر سید محمد اشرف کا تعارف بھیجا۔ وہ جب موصول ہوا تو پھر وہ کہانی شائع ہوئی۔ گویا یہ تھا ایک مدیر کا انوالومنٹ۔



عذرا فاطمی کی تصویری نمائش کے موقع پر شکیل عادل زادہ، عذرا فاطمی اور فردوس حیدر

س: سب رنگ کے باقاعدگی سے شائع نہ ہونے کی کیا وجوہات تھیں؟

ج: یہ بات ایک مرتبہ ابنِ انشاء نے میرے نام ایک خط میں بھی لکھی تھی کہ Perfectionist بننے کی کوشش مت کرنا، ناکام ہوجاؤ گے۔ اور واقعی ہوا یہ کہ ہم نے بہت کوشش کی کہ ''سب رنگ'' کو باقاعدگی سے شائع کریں مگر ناکام ہوگئے۔ جب بہزاد لکھنوی صاحب نے دعویٰ کیا کہ میں تمہارے لیے بھی کچھ لکھوں گا لیکن رئیس امروہوی صاحب نے انہیں مجبور کیا کہ آپ ''عالمی ڈائجسٹ'' میں جتنے پیسے لے رہے ہیں، اس سے ہم ڈیڑھ گنا کر دیتے ہیں لیکن آپ ''سب رنگ'' میں نہ لکھیں۔ میں نے کہا کہ دوگنا دے دیتا ہوں تو رئیس صاحب نے کہا کہ ڈھائی گنا کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا تین گنا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہوتا رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ رئیس صاحب کی وجہ سے بہزاد صاحب نے ''سب رنگ'' میں لکھنے سے انکار کر دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس زمانے میں ماورائی قسم کی کہانیاں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں تو انوار صدیقی نے کہا ''میں لکھوں گا'' اور پھر انہوں نے ''سونا گھاٹ کے پجاری'' لکھنا شروع کی۔ پھر اس کہانی پر ہم کام بہت کرتے تھے اور اس کی اچھی شکل بنا کر پیش کرتے تھے جیسے میں نے کہا کہ میری انوالومنٹ اس رسالے کے ہر شعبے میں بہت ہوتی تھی۔ پھر انوار صدیقی نے کہانی شروع کی ''اِنکا'' وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ احمد صغیر صدیقی ایک کہانی لائے تھے میرے پاس جو ڈیڑھ دو صفحے کی تھی، اس میں یہ تھا کہ ایک شخص نے کسی کو قتل کر دیا اُسے پکڑ لیا گیا۔ پھر اس سے پوچھا کہ کیوں قتل کیا؟ کہنے لگا میرے سر پر کوئی عورت بیٹھی تھی، اس نے مجھے آمادہ کیا کہ اس آدمی کو قتل کر دو، میں نے کر دیا۔ اس نے کہا کیا میرے سر پر آسکتی ہے وہ



شرجیل (بیٹا) اور اقبال مہدی کے ہمراہ

عورت؟ کہنے لگے اس کی مرضی تو وہ اس کے سر پر بھی آ گئی۔ یہ کہانی تھی تو ہم نے کہا کہ اس کہانی سے ہم کوئی لمبی کہانی بنا سکتے ہیں تو بنائی اور یوں ''انکا'' کہانی وجود میں آئی جو بہت مقبول ہوئی لیکن انوار صدیقی کے ہاں یکسانیت بہت تھی۔ دیکھئے ایک لفظ ہے ''رونا'' اب رونے کے بجائے اگر آپ یہ لکھیں کہ وہ رو دیا، یا روتا رہا، اس پر رقت طاری ہوگئی یا آنسو بہنے لگے۔ اس کو طرح طرح سے ہونا چاہئے۔ اگر ایک ہی لفظ پر اصرار کرتے رہیں گے تو کہانی بے جان ہو جائے گی۔ تو پھر ''امر بیل'' تقریباً میں نے لکھنی شروع کی دو ڈھائی سال تک۔ پھر ''اقابلا'' لکھی میں نے۔ ''اقابلا'' کا آغاز انوار صدیقی نے کہا اور عربی ڈکشن ان کا تھا ہی نہیں لیکن مجھے جون ایلیا صاحب کی قربت کی وجہ سے عربی ڈکشن سے خاصا لگاؤ تھا۔ جون صاحب ہمارے استاد ہیں یعنی انہوں نے ہمیں بہت سکھایا۔ ان کے خاندان نے ہمیں بہت سکھایا۔ ان سے بہت کچھ سیکھا کہ لفظ کی حرمت کیا ہوتی ہے تو ''اقابلا'' لکھی تو پھر بہترین آرٹسٹ اقبال مہدی صاحب، ہمارے ساتھ تھے تو پیشکش مختلف تھی پھر پرچہ تاخیر کا شکار ہونے لگا اسی تگ و دو کی وجہ سے لیکن یہ یقین پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شخص بے ایمانی نہیں کرے گا۔ یہ باقاعدہ ہونے کے لیے خراب پرچہ نہیں لائے گا یعنی اس کے معیار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہوگا تو یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ بعض اوقات ''سب رنگ'' چھ مہینے اور ایک سال کے وقفے کے بعد شائع ہوا۔

س: ''سب رنگ'' کی اشاعت کے دوران کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کتنے دورانیے کا وقفہ آتا تھا؟

ج: دو مہینے تو کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ پونے چار سال بھی وقفہ آیا۔ اسی دوران بیٹی کے دل میں سوراخ تھا اس وجہ سے ہمیں اس کے علاج کے لیے بیرون ملک جانا پڑا پھر قسطیں میں لکھ نہیں رہا تھا تو وقفہ آ گیا۔



اہلیہ کے ہمراہ (۱۹۷۵ء)

س: ''بازی گر'' کا آغاز کیسے ہوا؟

ج: ہم نے سوچا کہ یہ جو دیو مالائی قسم کی کہانیاں ہیں ان سے نجات پائیں اور ہم حقیقی زندگی کے واقعات پر مبنی کہانیاں شروع کریں تو ''بازی گر'' شروع ہوئی۔ ''امبر بیل'' کے آخر میں بھی حقیقی زندگی کے واقعات شامل کیے تھے لیکن دیگر اہم کہانیوں سے ''بازی گر'' کچھ زیادہ ہی مقبول ہو گیا۔

س: جب آپ نے بازی گر کا آغاز کیا تو آپ کو اندازہ تھا کہ یہ اتنا مقبول ہوگا؟

ج: نہیں! بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر مقبول ہوگا۔

س: گزشتہ چند برس سے ''سب رنگ'' کی اشاعت کے حوالے سے مختلف اطلاعات گردش کرتی رہیں۔ کبھی معلوم ہوتا کہ دبئی کا ایک اشاعتی ادارہ ''سب رنگ'' شائع کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور اس نے کچھ شمارے شائع بھی کیے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ''جنگ گروپ'' بھی سب رنگ شائع کرنا چاہتا ہے۔ اس کی بے قاعدہ اشاعت نے ''بازی گر'' کی طوالت پر بھی اثر ڈالا؟

ج: ہاں اصل میں یہ سلسلہ میرے دوست حسن ہاشمی نے شروع کیا تھا میری تحریک پر۔ میں نے انھیں کہا تھا کہ کوئی ایسی چیز لکھو جس میں ''دیو مالائی'' قصے نہ ہوں بلکہ حقیقی واقعات کی عکاسی ہو۔ اس نے پہلی قسط لکھی، اس کو میں نے دوبارہ تحریر کیا تو حسن ذرا ناراض بھی ہوا کہ تم ہی لکھ رہے ہو تو تم ہی لکھا کرو۔ پھر میں نے مستقل لکھنا شروع کر دیا۔ یہ لوگوں کو پسند آتی رہی تو ہم اس میں اور شامل ہوتے گئے اس سے کہانی کا پلاٹ اور کردار بھی پھیلتے گئے۔ پھر یہ سوچا کہ تاخیر سے آنے والا ایک بہترین پرچہ نکالنا چاہئے، نہ کہ تواتر سے آنے والا خراب پرچہ نکالا جائے یعنی مقدار پر معیار کو ترجیح دی جائے۔ اچھا چونکہ پرچہ میرا تھا تو وہ میں ہی کر سکتا تھا لیکن اگر کہیں میں ملازم ہوتا یا میرا کوئی شراکت دار ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اس میں پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ۲۲ آدمیوں کا عملہ تھا، ان کو ہر مہینے پیسے دینے ہوتے تھے جو جائیدادیں خریدی تھیں وہ بکتی چلی گئیں لیکن پرچہ ہم نے ہلکا نہیں کیا۔ پھر میر شکیل الرحمٰن سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا ہم نکالیں گے اپنے ادارے کے تحت لیکن ادارت آپ کی ہی ہوگی۔ ان کے معاہدہ بھی طے پا گیا۔ لکھت پڑھت بھی ہو گئی لیکن میر شکیل صاحب ''جیو'' کو شروع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دن گزرتے گئے ادھر ہماری مالی حالت خراب ہو رہی تھی تو میرے دوست تھے دوبئی میں محمد اسلم ملک، ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کو یہ سوجھی کہ کراچی سے کوئی پبلیکیشن نکالیں تو انھوں نے مجھ سے بات کی ''سب رنگ'' کی تو جو شرائط میر شکیل الرحمٰن سے طے کی تھیں وہی ان سے بھی طے ہو گیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ دو سال کے عرصے میں اس کی اشاعت باقاعدہ کر دیں گے۔ بڑی کوشش کی، نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا میرا نقصان ہو رہا ہے۔ میں نے کہا پرچہ اب آپ کے نام پر ہے، آپ نکالیے تو وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ یہ اگر رہا تو پرچہ کبھی باقاعدہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ معاہدہ منسوخ ہو گیا۔ ادھر میر شکیل نے یہ کہہ دیا مجھ سے کہ یہ ''جیو'' کے لیے جو سکرپٹ آتے ہیں کہانیوں


پیش نوشت

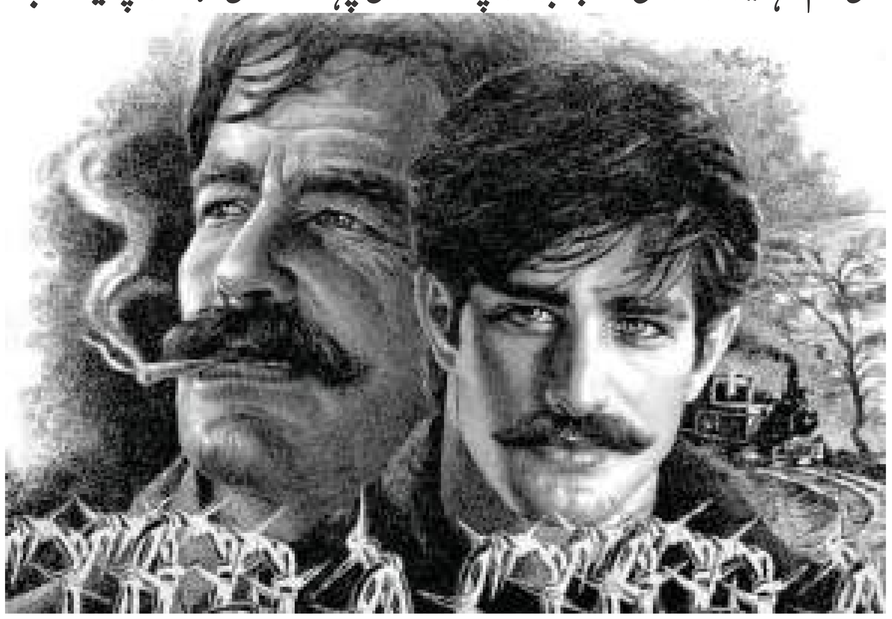
کے، ان کو دیکھ لینا۔ میں نے ایک ملازمت کا سلسلہ بھی وہاں شروع کر دیا تھا تو ایک ذرا آسانی ہوگئی تھی کہ گھر چلتا رہے گا تو میں نے راشد ملک سے نجات حاصل کی اور ان سے علیحدہ ہوگیا لیکن اس عرصے میں ''بازی گر'' ادھوری رہ گئی۔

س: عاشقانِ سب رنگ کیا اس انٹرویو کے ذریعے ''بازی گر'' مکمل ہونے کی خوشخبری سن سکتے ہیں؟

ج: صورت یہ ہے کہ بازی گر جو کوئی پندرہ سال سے ادھوری ہے، لاہور میں ایک صاحب ہیں اجمل شاہ دین، انھوں نے کہا کہ میں اس پر ایک سو اقساط پر مبنی پر ایک ٹی وی سیریل بنانا چاہتا ہوں تو یہ مجھے دے دیں۔ ہم نے وہ انھیں دے دی۔ انہوں نے کہا کہ بھئی اس کا اختتام لکھ دو تو اب میں اس کا اختتام لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ۱۲۰ر صفحے تو میں نے لکھ لیے ہیں کچھ اور رہ گئے ہیں شاید چار پانچ مہینے میں مکمل ہو جائے اور رواں سال کے آخر تک قارئین کو اس کی تکمیل کی خوشخبری مل جائے۔

س: ''بازی گر'' کی کہانی ہندوستان اور پاکستان کے مختلف شہروں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر اس کا ہر کردار اپنی ایک منفرد شناخت اور خصوصیت کا حامل ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنی طویل لکھی گئی کہانی پر ٹی وی سیریل بنائی جاسکتی ہے؟

ج: بہت مشکل ہے، لیکن ان کو یقین ہے کہ ہم کرلیں گے۔ میں نے انھیں یہ بھی کہا ہے کہ میں اسکرپٹ نہیں لکھوں گا۔ اسکرپٹ دیکھوں گا ضرور اور تمام مراحل میں شامل رہوں گا۔ ٹی وی کے لیے اسکرپٹ لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ ''جیو'' کے لیے میں اسکرپٹ دیکھتا رہا ہوں تو وہ کسی دوسری طرح کام محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ میرے لکھنے کی رفتار اب کافی سست ہے ۱۵ر سال کا وقفہ آ گیا تھا۔ بڑی پرانی بات ہوگئی ہے۔ پہلے پورے کا پورا ''بازی گر'' پڑھنا پڑا ہے۔ میں اس کے کردار بھول گیا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں اس کا آغاز ہوا تھا اب چونکہ وہ میرے دل کی تحریر ہے تو میں پھر کوشش کر رہا ہوں کہ اب بھی ویسی ہی لکھوں۔ یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ وہ جوش، وہ جذبہ جو آپ کا ۱۵ سال پہلے تھا وہ نہیں رہتا۔ آپ بیمار ہو جاتے ہیں



۔دراصل آپ کے حواس وہ نہیں رہتے۔ پھر آپ کی تخلیق پر عمر کے اثرات بھی پڑتے ہیں۔اب انھیں دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

س: ایک مرتبہ میرے والد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ جب ''سب رنگ'' میں شوکت صدیقی صاحب کی کہانی ''جانگلوس'' کا آغاز ہوا تو ان کا آپ سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ جب تک یہ کہانی ''سب رنگ'' میں مکمل نہیں ہوگی اس وقت تک اس کو کتابی صورت میں شائع نہیں کیا جائے گا لیکن اسی زمانے میں اس کہانی کی پی ٹی وی نے ڈرامائی تشکیل نشر کرنا شروع کر دی۔ان واقعات میں کتنی صداقت تھی؟

ج: دیکھئے ہوا کیا کہ یہ طے ہو گیا تھا کہ چونکہ شوکت صدیقی صاحب کو ہم پیسے دیتے تھے تو وہ کہانی ''سب رنگ'' کی ملکیت تھی لیکن جب ''سب رنگ'' کی اشاعت میں عدم تواتر ہوا تو شوکت صاحب بہت مایوس ہوئے کہ یار یہ کتاب تو کبھی نہیں چھپ سکے گی۔تو ان کے دوست تھے نثار صاحب، ان کا خود ایک اشاعتی ادارہ تھا، وہ بھی اس کہانی کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔پھر پی ٹی وی کراچی کے تاجدار عادل نے ان سے ٹی وی کے لیے بات کی تو شوکت صاحب تیار ہو گئے۔ٹی وی کے لیے ہم نے ان سے اتنا کہا کہ ٹی وی پر چلے تو ٹھیک ہے لیکن اس میں بشکریہ ''سب رنگ'' ضرور ہونا چاہئے۔اس پر ٹی وی والے آمادہ نہیں ہوئے۔ہم نے ٹی وی پر مقدمہ کر دیا۔اس وقت بے نظیر بھٹو صاحبہ ملک کی وزیر اعظم



تھیں اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اگر یہ ''جانگلوس'' مزید چلتا رہا تو اس کے ذریعے ملک کے جاگیرداروں اور وڈیروں کے مظالم اور عزائم بے نقاب ہو جائیں گے لہٰذا ٹی وی نے ۱۷/اقساط کے بعد ''جانگلوس'' کو اپنی

طرف سے اچانک بند کر دیا اور لوگ یہ سمجھے کہ ''سب رنگ'' مقدمہ جیت گیا ہے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن جس زمانے میں مقدمے بازی ہو رہی تھی تو اس زمانے میں انٹرویو بہت چھپ رہے تھے میرے، شوکت صاحب اور ٹی وی والوں کے جبکہ اس چکر میں ''سب رنگ'' کی بھی خوب پبلسٹی ہو رہی تھی۔ اچھا پھر ''جانگلوس'' کو میں نے ''جیو'' کو بکوا دیا۔ شوکت صاحب کا معاہدہ کروایا میں نے بڑے اچھے پیسوں میں اور آخر میں یہ ہوا کہ شوکت صاحب شدید بیمار ہوئے اور ''جیو'' ان کے پیسے نہیں دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے بار بار کہتے کہ یار میرا ایک انجکشن ۳۰۰ روپے کا آتا ہے۔ وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئے، بہر حال میں نے بڑی کوشش کی اور ان کو ''جیو'' سے پھر تمام پیسے مل گئے۔

س: آپ کی صدر پاکستان ضیاء الحق سے ہونے والی ملاقات کا بڑا شہرہ رہا؟

ج: ہاں وہ بھی ایک کہانی ہے خیر ہوا یہ کہ سی پی این ای (CPNE) کا ایک جلسہ تھا اسلام آباد میں تو ''سب رنگ'' بھی رکن تھا سی پی این ای کا۔ ہمیں بھی بلایا گیا وہاں اسلام آباد ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ صدر ضیاء الحق صاحب اس تقریب میں آئے تو لوگ قطار میں کھڑے ہو گئے اور ان سب کا جب صدر صاحب سے تعارف کرایا جا رہا تھا۔ سی پی این ای کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل انور خلیل نے میرا ضیاء صاحب سے تعارف کرایا کہ ''شکیل عادل زادہ - مدیر سب رنگ ڈائجسٹ'' میرے برابر میں کھڑے تھے میر خلیل الرحمٰن۔ صدر صاحب پہلے تو آگے گزر گئے پھر ایک دم پیچھے مڑے اور کہنے لگے ''سب رنگ'' والے کون سے صاحب ہیں ؟ تو روزنامہ جنگ کے مالک میر صاحب نے کہا کہ یہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بھئی آپ کے رسالے کی بڑی تعریف سنی ہے میں نے، پڑھا تو نہیں۔ میں نے کہا میں پیش کر دوں گا۔ تو یہ باتیں کرتے ہوئے وہ باقی لوگوں سے ملنے گئے۔ دوسرے دن میں نے بھائی انور خلیل سے کہا کہ میری کسی طرح سے ضیاء الحق صاحب سے ملاقات کرا دیں۔ انھوں نے کہا بہت مشکل ہے۔ میں نے کہا کچھ کوشش کریں۔ انہوں نے بریگیڈئر صدیق سالک سے کہہ کر بہر حال شام چھ بجے کا وقت مقرر کروالیا۔ ہم شیروانی وغیرہ پہن کر تیار ہو گئے اور جناب حسین ہاشمی ایم ڈی ''اوریئنٹ ایڈورٹائزنگ'' نے اپنی گاڑی دے دی۔ ہم راستے سے ''سب رنگ'' کا تازہ شمارہ خرید کر ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ اس ملاقات میں صدیق سالک صاحب، شاہنواز اور آغا شاہی بھی موجود تھے۔ ان سب سے بھی مختلف امور پر باتیں ہوتی رہیں۔ خیر ۲۵ منٹ انتظار کے بعد ہمیں ضیاء الحق صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ ہماری ملاقات کا وقت مقرر تھا صرف پانچ منٹ، لیکن وہ بڑھتی چلتی گئی چونکہ باتیں ایسی ہوتی رہیں تو ''سب رنگ'' کا جب ذکر ہوا تو انھوں نے کہا میں نے تو نہیں دیکھا تو میں نے انھیں فوراً پیش کر دیا۔ وہ بہت بے تکلفی کا ماحول تھا۔ تو کہنے لگے اس میں عورت کی تصویر کیوں ہے؟ میں نے کہا اس سے رسالے کی کچھ دیدہ زیبی ہو جاتی ہے۔ کہنے لگے نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں مرد کی تصویر ہو اور نہ میری تصویر ہو لیکن اگر مرد کی تصویر بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ میں نے کہا ہاں ایک رواج ہے کہ خواتین کی



تصویر پر لوگ زیادہ ملتفت ہوتے ہیں، متاثر ہوتے ہیں۔ یہ میں کہتا رہا پھر انھوں نے پوچھا کہ آپ مذہب پر کیا چھاپتے ہیں، ہم نے کہا تصوف کا سلسلہ۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تصوف کے تو وہ اس قدر خلاف تھے ۔ کہنے لگے تصوف کا میں نہیں کہہ رہا اور بھی چیزیں ہیں مذہب کے سلسلے میں۔ میں نے کہا Fillers ہوتے ہیں، وہ چھاپتے ہیں ہم۔ خیر وہ رسالے ان تک پہنچے تو تمام کے سرورق پر لڑکیاں تھیں تو یہ ہوا کہ پہلا کام کہ ہمارا اخباری کوٹہ ہی بند کر دیا گیا بجائے بڑھانے کے اس کو بند ہی کر دیا۔ اچھا میں گیا تھا ان کے پاس یوں کہ میں نے عرصہ پہلے ایک خواتین کے پرچے کا ڈیکلریشن فائل کیا تھا وہ مجھے مل ہی نہیں پا رہا تھا تو میں نے ضیاء الحق صاحب سے یہ کہا تھا کہ مجھے اس پرچے کا ڈیکلریشن چاہئے۔ کہنے لگے کہ جب پہلے ہی اتنے سارے خواتین کے پرچے نکلتے ہیں تو آپ کیوں نکالنا چاہ رہے ہیں؟ میں نے کہا ایک اور اچھا پرچہ نکل آئے گا تو انھوں نے صدیق سالک صاحب سے کہا کہ یہ مسئلہ حل کرا دو تو اس وجہ سے میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔ ورنہ کوئی اور وجہ نہیں تھی پھر میں نے ان سے بہت باتیں کیں۔ میں نے ان سے اس وقت یہ بھی کہا کہ آپ اردو میں ٹائپ سسٹم بذریعہ سرکار نافذ کریں تا کہ کتابت سے ہم بچ جائیں اور ایرانیوں نے بھی نسخ رسم الخط اختیار کر لیا ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر صدیق سالک صاحب نے بھی سمجھایا کہ دیکھیئے آپ تقریر کرتے ہیں اردو میں، یہ تقریر جاتی ہے ہے نیوز ایجنسی وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ پھر وہ اخبارات کو بھیجتی ہیں اور اخبارات اس کا پھر اردو میں ترجمہ کرتے ہیں اگر ٹائپ کا یہ سسٹم ہو جائے تو یہ آپ کی اردو تقریر اردو میں ہی جائے تو یہ بھی ایک وجہ تھی ان سے ملاقات کی۔ وہ کہنے لگے کتنے کاتب ہوں گے کراچی میں؟ میں نے کہا مختلف اخباروں میں ہوں گے چار پانچ ہزار۔ کہنے لگے وہ بیروزگار ہو جائیں گے۔ میں نے کہا ایوب خان صاحب نے ۵ ہزار سائیکل رکشے والے ایک دن میں بند کر دیے لیکن وہ بیروزگار نہیں ہوئے تو کتابت کے لیے مسلسل بیٹھ کر لکھنا ویسے ہی ایک دقت طلب کام ہے، خیر یہ باتیں ہوئی تھیں۔ جب ہم رخصت ہوئے تو ضیاء الحق صاحب میں اتنا تواضع تھا کہ انھوں نے خود دروازہ کھولا اور گاڑی میں بٹھایا۔

س: دورۂ ہندوستان کے دوران آپ کا قیام معروف فلم ساز کمال امروہوی کے گھر رہا وہاں آپ کی نشستیں معروف اداکارہ مینا کماری سے بھی رہیں۔ ان کو آپ نے گھریلو زندگی میں کیسا پایا؟

ج: کمال امروہوی رئیس امروہوی صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔ یہ سن ساٹھ کا ذکر ہے میں رئیس امروہوی صاحب کی بیگم کے ساتھ ہندوستان گیا ہوا تھا۔ ان دنوں کمال امروہوی صاحب کا بہت بڑا اسٹوڈیوز تھا ''کمال اسٹوڈیوز'' کے نام سے ''اندھیری'' میں اور وہ اس زمانے میں عروج پر تھے۔ رئیس امروہوی صاحب کی بیگم نے امروہہ جانے کا ارادہ کیا تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ واپسی پر بمبئی میں ہمارا قیام کمال امروہوی صاحب کے گھر ہوا۔ وہ اپنی دوسری اہلیہ نامور اداکارہ مینا کماری کے ساتھ باندرہ میں رہتے



مینا کماری

تھے۔ مینا کماری مذہبی مزاج کی حامل خاتون تھیں وہ روزانہ قرآن شریف کی تلاوت بھی کرتی تھیں۔ ہمارا قیام وہاں دو ہفتے رہا۔ ان سے زیادہ گفتگو شعروشاعری کے حوالے سے ہوتی۔ روزانہ رات کو ان کے ساتھ تاش کی بازی بھی لگتی اور ہارنے والے کو جیتنے والے کے پاؤں چھونے پڑتے۔ ایک مرتبہ ہم بازی جیت گئے تو ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود مینا کماری نے ہمارے پاؤں چھوئے اور کہا کہ ہم ہار گئے بھئی تم جیتے۔ پاکستان آنے کے بعد ہماری ان سے کچھ عرصہ خط وکتابت بھی رہی لیکن پھر یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ مینا کماری بہت بڑی اداکارہ تھیں اور ان سے روزانہ صبح شام، گاہے بگاہے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس زمانے میں مشہورِ زمانہ فلم ''پاکیزہ'' کی شوٹنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے کپڑے سل رہے تھے وہ انھوں نے مجھے دکھائے کمال صاحب بھی ابا کو جانتے تھے۔

س: مینا کماری شاعری بھی تو کرتی تھیں اور ناز تخلص کرتی تھیں؟

ج: ہاں وہ بہت اچھی شاعرہ بھی تھیں اور جب میں نے انھیں بتایا کہ ''امیر علی ٹھگ'' کے نام سے جو سلسلہ شائع ہوا ''سب رنگ''، میں، وہ میں نے لکھا تھا۔ بڑی خوش ہوئیں۔ میری ان سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی تھیں تو یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ شاعری بھی کرتی ہیں اور رئیس امروہوی صاحب سے اصلاح لیتی تھیں۔

س: اور کن کن فلمی شخصیات سے اس دوران آپ کی ملاقاتیں رہیں؟

ج: میری شکیل بدایونی اور گلزار صاحب سے بہت نشستیں رہیں۔ پھر ایک اداکارہ شمی تھیں، روزانہ تقریباً کمال صاحب کے ہاں آتی تھیں جو بعد میں ٹی وی اسٹار بھی بنیں اور بہت سے لوگ تھے۔ راج کمار سے خوب ملاقاتیں رہیں وہ کمال صاحب کے بڑے دوست تھے۔ اصل میں یہ بات ہے سن ۶۰، ۶۲ء کی۔



گلزار کے ہمراہ

س: آپ نے ''سب رنگ'' میں جانوروں کی نفسیات کے حوالے سے بھی کہانیاں شائع کر کے اردو ادب کے قارئین کو نت نئے موضوعات سے بھی متعارف کروایا۔ یہ خیال کس کا تھا؟

ج: چچا ابوالفضل صدیقی کی وجہ سے، انھوں نے کمال غضب کی اور اپنی نوعیت کی منفرد کہانیاں لکھیں تھیں۔ پہلے جانوروں پر خوب لکھیں پھر رفیق حسین صاحب کی کتاب ہمارے ہاتھ لگ گئی وہ بھی جانوروں پر ہے پوری۔ وہ طرح طرح کے ناموں سے شائع ہوتی رہی۔ پھر انور خواجہ صاحب جواب امریکہ میں ہیں جانوروں پر انہوں نے بھی کچھ کہانیاں لکھیں۔ یہ سلسلہ شروع کیا تھا ''اردو ڈائجسٹ'' نے شکاریات کا تو ہم نے اس کو ذرا مختلف انداز دے دیا۔

س: آپ نے ''سب رنگ'' کا معیار اتنا بلند کر دیا تھا کہ آپ اپنے وقت کے بعض ادیبوں کی کہانیاں مسترد کر دیتے تھے جیسے کرشن چندر کی کہانی بھی آپ نے مسترد کر دی تھی؟

ج: ہاں ہوا یہ کہ ہم کرشن چندر صاحب کے افسانے بہت چھاپتے تھے، ان کو پیسے بھی بھیجتے تھے دبئی کے ذریعے ،تو میری ان سے دوستی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک دن بہت بیمار تھے اسپتال میں تو انھوں نے کہا کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے اور فوراً ہندوستان، پاکستان سے پیسے نہیں جا سکتے تھے تو میں نے اپنے دوست ملک صاحب سے کہا ان کا ممبئی میں کاروبار تھا تو انھوں نے خود جا کر دیے۔ تو ان سے بڑا اچھا تعلق تھا میرا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ''سب رنگ'' کے لیے کوئی قسط وار کہانی لکھیں۔ انہوں نے ''سونے کا سنسار'' کے نام سے ایک ناول لکھا جو میں نے سب لوگوں کو پڑھوایا جو میرا دستور تھا۔ وہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح منع کیا جائے کرشن چندر کو لیکن ایک تعلق تھا ان سے لہٰذا میں نے ان سے کہا کہ یہ ''سب رنگ'' کے خانے میں پورا نہیں اترتا۔ خیر وہ سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا لکھوں؟ میں نے کہا آپ الف لیلیٰ جدید لکھیں لیکن وہ بیمار ہو گئے لیکن لکھتے ضرور اگر ان کی صحت اجازت دیتی یا عمر وفا کرتی۔



کرشن چندر اور انکی اہلیہ سلمیٰ صدیقی

س: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

ج: آج کل ''جیو'' سے منسلک ہوں۔ ''جیو'' پر اسکرپٹ رائٹر ہوں وہ پیسے دے دیتے ہیں اور میں لکھتا رہتا ہوں دن بھر۔

س: کیا ''سب رنگ'' کی دوبارہ اشاعت ممکن ہے؟

ج: نہیں بالکل نہیں، اس کی وجہ یہ ہے اب کہ اردو پڑھنے کا وہ حال نہیں رہا ہے جو آج سے بیس تیس سال پہلے تھا ۔اب آپ کا کوئی بچہ اردو مدرسے میں نہیں پڑھتا۔ اب آپ کا بچہ ہو تو آپ کی خواہش یہی ہوگی کہ آپ اس کو انگریزی اسکول میں داخل کرائیں چنانچہ وہ ''بہتر'' نہیں جانتا وہ سیونٹی ٹو جانتا ہے اور آپ کو اسے بتانا پڑتا ہے کہ بیٹے ''بہتّر'' اسے کہتے ہیں۔ جو ڈائجسٹ آج کل شائع ہو رہے ہیں، سنا ہے کہ ان کی تعداد

اشاعت خاصی کم ہوگئی ہے تو اب فکشن پڑھنے کا بھی وہ دور نہیں رہا کیونکہ ٹیلی ویژن نے اتنے ڈرامے شروع کر دیے ہیں کہ لوگوں کا فکشن پڑھنے کا شوق وہاں سے پورا ہو جاتا ہے۔ اردو اب اس طرح کا نہیں رہا جو ہمارے زمانے میں تھا تو اب یہ کہ آپ کے پاس بہت سرمایہ ہو اور اردو سے آپ کو بڑی محبت ہو اور آپ خود چاہتے ہوں تو تب تو نکل سکتا ہے۔

س: آپ نے ماشاءاللہ اتنی بھرپور ادبی زندگی گزاری، کیا اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کا کوئی ارادہ ہے؟

ج: یار بہت لوگ کہتے ہیں، میں ضرور لکھوں گا لیکن پہلے ''بازی گر'' نبٹ جائے۔

س: کبھی ناسٹیلجیا کا شکار ہوتے ہیں؟

ج: ظاہر ہے ہر شخص کو یاد آتا ہے اپنی جوانی کا زمانہ

س: آپ کے قریبی ساتھیوں میں سے بہت سی شخصیات اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں جب ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں تو کن شخصیات کی یاد شدت سے آتی ہے؟

ج: جون ایلیا صاحب بہت یاد آتے ہیں ان سے بہت تعلق رہا اور بہت سے لوگ ہیں، احسان دانش صاحب سے ملاقاتیں بہت کم رہیں لیکن یہ کہ بہت اچھی رہیں۔ چچا ابوالفضل صدیقی، میں انھیں چچا کہتا تھا۔ میں نے جب ان کو معاوضہ دیا ''سب رنگ'' کا کہنے لگے شکیل یہ پہلا معاوضہ ہے جو مجھے اپنی کسی تحریر پر ملا ہے تو وہ بہت یاد آتے ہیں۔ شوکت صدیقی صاحب سے تعلق تھا میرا۔ لڑائی بھی کی، مقدمہ بازی بھی ہوئی مگر تعلق قریبی رہا۔ بہت سے لوگ ہیں کس کس کا نام لیں۔



فواد احمد اور شکیل عادل زادہ

وجاہت مسعود

کہا جاتا ہے کہ اخباری کالم کی عمر ایک دن کی ہوتی ہے لیکن کچھ کالم نگار اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کے کالم کو سدا بہار کالم کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اردو کالم نگاروں کی فہرست پر نظر دوڑائیں تو ایسے کالم نگار صرف انگلیوں ہر گنے جا سکتے ہیں جن میں یہ وصف بدرجہ اُتم پایا جاتا ہے جیسے مولانا چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، ابنِ انشاء، انتظار حسین، منو بھائی، زاہدہ حنا، کشور ناہید اور رضا علی عابدی کے اسمائے گرامی فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ان تمام کالم نگاروں کی ایک اور اہم خصوصیت اپنے کالمز میں ادبی چاشنی کا شامل کرنا ہے جس کے باعث ان کالمز کو بار بار پڑھنے مَن کرتا ہے۔ اسی رویت کو مزید آگے جس شخصیت نے بڑھایا، آج وہ خود ایک روایت کا مضبوط استعارہ بن چکے ہیں ان کا نام ہے وجاہت مسعود۔ جن کو ثقیل سے ثقیل موضوع کو ادبی رنگ میں سمو کر اپنے کالم کو زندہ و جاوید بنانے کا ہنر خوب آتا ہے۔ وجاہت مسعود کا حافظہ غضب کا ہے جس کا اظہار وہ اکثر اپنے کالمز میں مضبوط و مستند حوالہ جات کے ذریعے کرتے ءرہتے ہیں۔ ان کا جنم ۱۹۶۶ء میں گوجرانوالہ میں ہوا۔ گورنمنٹ لاہور سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی زبان و ادب میں ایم اے کیا۔ برطانیہ کی لیڈز یونیورسٹی سے انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی اور یورپی قانون میں ایل ایل ایم کی سند حاصل کی۔ انسانی حقوق کی سربلندی کو اپنی زندگی کا مطمع نظر بنایا۔ ۱۹۹۴ء میں جمہوری کمیشن برائے انسانی حقوق کے بطور بانی رکن بنیاد رکھی اور ۱۲ برس اس ادارے کے سربراہ کے طور پر پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں انسانی حقوق کی تعلیم کا فرض ادا کیا۔ اس ادارے کے تحت ایک جریدہ ''نوائے انسان'' جاری کیا جس نے ملک کے طول و عرض میں انسانی حقوق کے حوالے سے تخلیق پانے والے شعر و ادب کو یکجا اور شائع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وجاہت مسعود نے جس میدان کا بھی رخ کیا وہاں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ تصنیف و تالیف کی طرف آئے تو ''نوبل انعام یافتگان کی افسانے'' کے عنوان سے تراجم کی کتاب تصنیف کی۔ اس کے علاوہ ''مولوی تمیزالدین بنام وفاق''، ''امن ممکن ہے''، ''سہروردی کی سیاست بیتی''، ''کشمیر اور انتقالِ اقتدار'' اور ''لسانی فسادات اور صحافت'' کے عنوانات کے تحت کتابیں لکھیں۔ کالمز کے مجموعوں کے دو حصے ''محاصرے کا روزنامچہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ بی بی سی اردو کی ویب سائٹ کے لیے بھی کالم نگاری کی جس کے لیے معروف شہنائی نواز اُستاد بسم اللہ خاں کے انتقال پر لکھے جانے والا تعزیتی کالم کا شمار اب شاہکار کالم کے طور پر کیا جاتا ہے۔ پیشہ وارانہ طور پر آپ ملک کے نامور تعلیمی اداروں سے بطور استاد اور مؤقر انگریزی اور اردو اخبارات و رسائل سے بطور قلمکار منسلک ہیں۔ پاکستان کی مقبول ترین اور منفرد ویب سائٹس ''ہم سب'' کے بانی اور مدیر اعلیٰ ہیں۔ دھیمے سُروں اور میٹھے لہجے میں بات کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ شدید اختلاف کے موقع پر بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ۱۲ مارچ ۲۰۲۰ء کو بہاولپور میں سارا دن موسلا دھار بارش رہی لیکن شام ہوتے ہی مطلع صاف ہو گیا اور آسمان پر تارے جگمگ



کرنے لگے اور اسی شام ریڈیو پاکستان بہاولپور کے اسٹوڈیوز میں بھی ایک روشن ستارہ جگمگا رہا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مسلک وہی 'ترکِ رسوم' اور خواب وہی 'انساں کے نقشِ پا کی وسعت کا'۔ ایں قافلہ عمر عجب می گزرد ! آیئے وجاہت مسعود صاحب سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔



س: وجاہت مسعود صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ دورۂ بہاولپور کے دوران آپ نے وقت نکالا، ریڈیو پاکستان تشریف لائے۔اور ہمیں یہ موقع دیا کہ آپ کی باتیں آپ کی زبانی ہم اپنے سامعین تک پہنچا سکیں۔

ج: آپ کی عنایت.....آپ کا شکریہ

س: وجاہت بھائی آپ نے فنونِ لطیفہ اور انسانی حقوق سے متعلق جن شعبوں میں بھی قدم رکھا ان شعبوں کو اپنی شمولیت سے مزید معتبر کر دیا لیکن ہم ابتداء کریں گے اُس وقت سے جب گوجرانوالہ میں آپ نے آنکھ کھولی پھر بچپن، نوجوانی اور زمانہء طالبعلمی کا دور اور مدارج کب، کیسے اور کہاں طے کیے؟

ج: یہ تو آپ نے لمبے سفر پر بھیج دیا ایسا ہے کہ بہت غریب سے تھوڑا سا جو اوپر والا طبقہ ہوتا ہے، وہاں پیدائش ہوئی۔مہاجر تھا، ہمارا گھرانے کا مشرقی پنجاب، لدھیانہ سے تعلق تھا اور جو وسیلہ یہاں آ کر رزق کا بنا تھا مشقت تھی، مزدوری تھی، چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔کوئی علمی ماحول ایسا نہیں تھا۔وہ کوئی پختہ ذوق کے معاملات، کوئی فنونِ عالیہ سے تعلق کی باتیں نہیں تھیں لیکن خوش قسمتی یہ ہوئی کہ جن دنوں میں میری پیدائش ہوئی وہ ہمارے ملک میں کچھ منفرد برس تھے۔بقول میر تقی میرؔ ''جن روزوں درویش ہوئے، ہمارے پاس دولت تھی''۔اس زمانے میں اس ملک میں پیدا ہونے والی پہلی نسل نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کا دوسرا حصہ اور خواب تھے پاکستان کو بنانے کے، پاکستان بننے کے بعد جو خوابِ شکستہ ہوئے تھے ان کا تجزیہ کرنے کا، انہیں جاننے کا، اس میں اپنی رائے دینے کے دن تھے اور میرے دادا تھے جو برطانوی پوسٹل اینڈ ٹیلیگراف سروس میں ملازم رہے تھے، اور میری پھوپھی پرائمری اسکول کی ٹیچر تھیں لیکن یہ کہ دونوں بے حد شائستہ اور اُن سے میں نے ایک چیز سیکھی زندگی میں کہ اگر آپ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہوں جہاں آپ کے رتبے یا آپ کے منصب کا، یا آپ کے مقام کا تعین آپ کی نقصان پہنچانے کی طاقت سے ہو رہا ہو کہ آپ کسی کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ ایسے معاشرے میں بھی شریف بن کر رہا جا سکتا ہے اور رہنا چاہئے تو میری نظر میں یہ سبق اُن سے مجھے مل گیا تھا اور کافی حد تک کہنا چاہئے کہ ہمارا روایتی سوچ کا گھرانہ تھا۔ذات پات بھی تھی تھوڑی بہت، ایسی نہیں تھی جتنی ہم نے سن پچاسی کے بعد دیکھی اپنے ملک میں۔میونسپل کارپوریشن کے اسکول میں پڑھا لیکن یہ ہے کہ سجاد بھائی ایک بات میں نے دیکھی جو مجھے آج بھی بہت یاد آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بات ہو سکتا ہے کہ آج بھی درست ہو، عملاً شاید نہیں ہے۔وہ یہ ہے کہ آپ پاکستان کے کسی قصبے میں چلے جایئے، کسی شہر میں چلے جایئے آپ کو دو یا تین اساتذہ سرکاری سکولوں میں ایسے ملیں گے جنھوں نے نسلوں کی تہذیب کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس معاشرے میں اگر کوئی ہمیں نیکی، بھلائی اور ارفع خیالی کا کوئی مظاہرہ نظر آتا ہے تو اس کا سہرا ان غریب اور گمنام اساتذہ کے سر جاتا ہے جنھوں نے چشتیاں سے لے کر شکر گڑھ تک یعنی، پاکستان کا



وجاہت مسعود (گوجرانوالہ ۱۹۶۹ء)

کوئی کونہ یا صوبہ نہیں ملے گا۔ آپ پنجگور چلے جایئے، آپ چلاس چلے جایئے، آپ کو ایک استاد سڑک پر چلتا ہوا مل جائے گا جس کے بال سفید ہوں گے، جس کی مالی حالت بھی اچھی نہیں ہوگی لیکن اس نے اس ذوق وشوق میں اپنی زندگی گزاری ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دے رہا ہے۔ وہ اس معاشرے کو ثروت مند بنا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ ہر قصبے میں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری نسل ان اساتذہ کی اور ان سیاسی کارکنوں کی شکر گزار ہے جنھوں نے قربانیاں دیں اور اپنے معاشی امکانات معدوم کیے۔ ان کے گھرانے مشکلات سے گزرے لیکن جو بھی ان کی سوچ تھی اور جس سیاسی جماعت سے ان کا تعلق تھا، حتی المقدور انہوں نے پاکستان کی خدمت کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو معاشرہ اپنے استاد، اپنے سیاسی کارکن اور اپنے فنکار کا احترام نہیں کرتا وہ ایک پسماندہ معاشرہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے میں نے پاکستان کو ایک بہت ترقی یافتہ ملک پایا ہے۔ یہاں کے لوگ سیاسی کارکن، فنکار اور استاد کا رتبہ سمجھتے ہیں۔

س: آپ نے بڑی تفصیل سے اپنے بچپن کے ایّام کا ذکر کیا پھر جب آپ نے کالج کا رخ کیا تو وہ دور کیسا تھا؟ اس زمانے میں آپ کے آس پاس معاشرتی وملکی حالات کیسے تھے؟

ج: جی ایک تو میں کم عمر تھا، لڑکپن کے دن تھے، لیکن ان دنوں ہمارے ملک پر ایک بڑی آفت گزر گئی۔ میرا اشارہ جو 4 اپریل 1979ء کی طرف ہے۔ آمریت، سجاد پرویز! وہ اجتماعی ذلت ہے جس کے بعد قوم کے کسی فرد کا دامن بے داغ نہیں رہتا۔ آمریت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ قوم کے ضمیر میں دیمک لگ جاتی ہے۔ جو اس کو برا سمجھ رہے ہیں ان کے بھی، جو اس کے ساتھ اشتراک کرتے ہیں، اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ان کے بھی۔ یوں سمجھئے کہ اس میں بربادی سب کی ہوتی ہے۔ معاشرہ غریب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی اس ملک میں ابھی وہ توانا نسل تھی۔ جو ساٹھ کی دہائی میں جوان ہوئی تھی انہوں نے ایک ایسی شاندار مزاحمت کی اور مجھے پہلی دفعہ لفظ کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ معاشرے میں بہتری لانے کے لیے آپ کو ڈنڈا اور پستول اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے لفظ آپ کی دلیل ہے۔ قلم سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں ہے اور آپ کے بولے ہوئے لفظ جو ہیں وہ معاشرے پر اپنا اثر اور نشان چھوڑتے ہیں تو وہ ایک لحاظ سے ایک ایسا وقت بھی تھا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے بہت سے بے روزگار نوجوان جو تھے ان کا تلاشِ روزگار کے لیے ابھی امتحان شروع ہوا تھا۔ بھٹو صاحب نے پاسپورٹ جو کھولا تھا تو اس کے نتیجے میں یہ معاملہ ہوا تھا تو ایک مصنوعی سے خوشحالی بھی کسی حد تک آ گئی تھی اور پھر لوگوں میں یہ شوق پیدا ہوا کہ ان کے بچے پروفیشنل کلاس میں داخل ہو جائیں اس زمانے میں ڈاکٹر اور انجینئر کا بہت چلن تھا۔ میرے آباء واجداد بھی چاہ رہے تھے کہ مجھے میڈیکل کی تعلیم میں ہی جانا چاہئے۔ اچھا ہمیں روگ لگ گیا تھا ''لفظ'' کا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں کچھ ایسا براق یا ذہین نہیں تھا لیکن میں فیل بھی نہیں ہوتا تھا لیکن لاپروا تھا یعنی سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتا تھا پڑھائی کو۔ جس چیز کی جتنی لگن لگتی تھی اس میں چلے



جاتے تھے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ نصاب کو باقاعدگی سے پڑھنا، ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس میں کچھ آوارگی بھی تھی۔ بہت سی خطائیں بھی تھیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے آج کہ مجھے گھر میں شفقت ملی اور میرا یہ کہنا ہے کہ اگر والدین شفیق ہوں تو بچوں کو غربت کی چبھن محسوس نہیں ہوتی پھر بھائی میں نے ایف ایس سی کیا گوجرانوالہ سے۔ اب ہم تک ''لفظ'' پوری آب وتاب سے پہنچ گیا تھا۔ ہم نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے فیض صاحب کی کتابیں خرید لی تھیں اور ہم منٹو اور جالب کو بھی پڑھتے تھے اور میری جو پہلی محبت تھی شاعری میں وہ حیران کن طور پر عبدالحمید عدم تھے۔ پھر کچھ دیر کے لیے ساغر صدیقی بھی اس فہرست میں آئے لیکن عدم صاحب کی جو وارفتگی تھی، جسے کہنا چاہئے ان کا الہڑ گیان تھا، اس نے ہمیں لوٹ لیا۔ آگے چل کر وہ جو تنقیدی رجحان اور آپ کا پورا رکھ رکھاؤ پیدا ہوتا ہے، اپنی قدر پہچانی جاتی ہے وہ بعد کی باتیں ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ وہ شعلہ بھڑکا تو پھر میں نے میڈیکل کیا لیکن میں نے گھر والوں سے کہا کہ دیکھئے آپ نے مجھے حکم دیا تھا یہ ہو گیا ہے لیکن میری کوئی خواہش نہیں اس ذمہ داری کی۔ میں تو تاریخ اور ادب پڑھنا چاہتا ہوں اور اب میں جا رہا ہوں گورنمنٹ کالج لاہور تو جو ارد گرد کے لوگ تھے ان کا خیال تھا کہ کوئی ایسی بدنصیبی اس خاندان پر ٹوٹی ہے کہ بچہ اچھا خاصا ڈاکٹر بننے جا رہا تھا، پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہے اخبار پڑھتا ہے چوری چوری، اور لوگوں کے ہاں جو مختلف اخبار آتے ہیں وہ جا کے مانگ کے لاتا ہے، پڑھ کر پھر واپس دے کر آتا ہے تو پھر میں گورنمنٹ کالج لاہور آ گیا جہاں میری خوش نصیبی کہ بہت نفیس اساتذہ ملے۔ اساتذہ کے ضمن میں، میں کبھی بھی کم قسمت یا غریب نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے احسان میں بزرگوں کی شفقت اور اساتذہ کا فیض رساں ہونا ہے۔ استاد اگر کہیں کم سواد بھی ہے اور اگر اس میں قابلیت کی کچھ کمی بھی ہے اگر فیض رساں ہو تو طالب علم کو مالا مال کر دیتا ہے۔

س: اس وقت آپ کو کون کون سے اساتذہ یاد آ رہے ہیں جن سے آپ نے فیض حاصل کیا؟

ج: میں آپ سے عرض کیے دیتا ہوں کہ بظاہر ان کا مزاج بالکل مختلف تھا لیکن میری ذات پہ بہت گہرا اثر چھوڑا ۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ وہ مرحوم ہو گئے ۔ آرائے خان صاحب اور رشید احمد خان صاحب، یہ بمبئے سے آئے تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم پائی اور وہیں ساری زندگی پڑھایا۔ میں سمجھتا تھا کہ جسے کہہ لیں کہ احمد شاہ بخاری کے بعد، اس نمونے پر یا مزاج ان کا تھوڑا سا Aristocrat تھا، تھیٹر کے آدمی بھی تھے لیکن ان میں ایک اہم بات تھی کہ وہ تمدن کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک ایک سبق پڑھانے میں اگر ایک مہینہ بھی صرف ہو رہا ہے تو انہیں کتاب ختم کرنے سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی یعنی Taste for the word, Taste for the language تاریخی تناظر میں اور پھر وہ ہر لفظ کے مختلف Shades بیان کرتے تھے۔ آرائے خان صاحب سے ہمیں فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ پھر صابر لودھی صاحب سے، منیر لاہوری صاحب پنجابی پڑھاتے تھے اور انھوں نے ہمیں دو سال



پنجابی پڑھائی۔ وہ ہمارا اختیاری مضمون ہوتا تھا۔ اس میں ہمیں فائدہ یہ ہوگیا بھائی کہ آگے چل کر میں پھر کسی اور زبان میں شعر نہیں کہہ سکا۔ ایک تو اہم بات یہ ہوگئی نا سجاد بھائی کہ منیر لاہوری صاحب کی محبت میں ہم یہ جو ایک احساسِ کمتری لے کر آئے تھے، اپنے اپنے ماضی سے کہ کوئی زبان برتر یا کم تر ہوتی ہے، ہمیں یہ سبق مل گیا کہ زبان تو انسانوں کی میراث ہے۔ ہر زبان میں محبت کی لغت موجود ہے اور ہر زبان میں نفرت کی لغت بھی موجود ہے۔ یہ زبان کا قصور نہیں ہے اور پھر یہ ہمارے پرکھوں کی میراث ہے جیسے کوئی Specie ختم ہو جائے، معدوم ہو جائے تو انسانی تاریخ کا ایک حصہ گر جاتا ہے زبان اگر ختم ہوتی ہے تو وہ انسانی ورثے، انسانی وراثت کا، انسانوں کی میراث کا ایک ٹکڑا جو ہے وہ منظر سے کم ہو جاتا ہے۔ پھر آپ کو پتہ ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور ایک ذرا خاص طرح کا ہے تو ہم احساسِ برتری کے ساتھ بھی چلتے تھے۔ وہ انگریزی ادب کے حوالے سے ذرا زیادہ سمجھا جاتا تھا تو اس میں یہ ہوا کہ انگریزی ادب بھی پڑھا اور پنجابی ادب بھی پڑھا۔ اگر Execellence کا کوئی تعلق ہے وہ زبان سے نہیں، اس سے ہے کہ تمہیں زبان برتنا آئی۔ میری کوئی اردو تعلیم تو نہیں تھی جو کلاس میں پڑھائی کی تھی وہی تھی لیکن ہم نے اردو سے بھی محبت کی، انگریزی سے بھی محبت کی اور اس کو سیکھا۔ ہمارے اوپر بہت بڑا احسان ہے کہ ہماری نسلوں کے جو طعنے سن کر سر سید اور ان کے رفقاء شیخ عبداللہ علی گڑھ والے تھے اور یہاں پنجاب میں سر فضل حسین، خیبر پختون خواہ سے سردار اورنگ زیب تھے، ان سب نے بہت سی جگہوں پہ تعلیم کے چراغ روشن کیے ہیں۔ انھوں نے دراصل ہماری جیسی آنے والی نسلوں کے لیے وہ کھڑکیاں کھولیں جن سے ہمیں آج کا جو تخلیقی سانس ہے اس تک رسائی ملی۔ پھر اس کے بعد میں نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا پھر پرویز مشرف صاحب کے دور میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔

س: آپ انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے تو ادب کے میدان سے قانون کے میدان کا رخ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

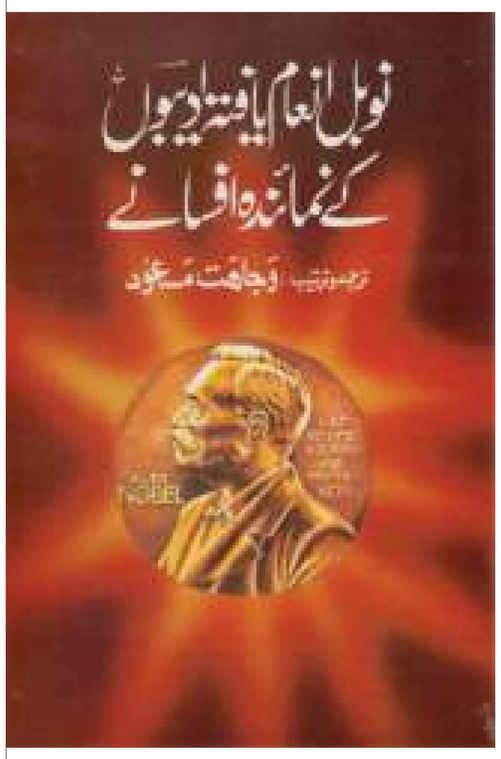
ج: میں عرض کیے دیتا ہوں، اس میں یہ ہوا کہ ادب کی تعلیم تو پائی لیکن مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی ندامت نہیں ہے لیکن اقرار کرنے کا حوصلہ بھی تو ہونا چاہیے۔ میں سکہ بند ادیب نہیں ہوں۔ میں کوئی سکہ بند شاعر نہیں ہوں۔ اگر مجھے کہیں کہا جائے کہ یار ایک سطر ہی لکھ دو ذرا اس کو بیان کرو تو میں کہوں گا کہ میں ایک متشکر اور احسان مند انسان ہوں جس نے اپنی سی کوشش کی کہ انسانوں کی زندگی میں تھوڑا سا کچھ احسان کا بدلہ واپس دیا جائے جو فیض نے کہا نا:

؎ اپنا موضوعِ سخن اُن کے سوا اور نہیں

سو بنیادی طور پر میں کہوں گا کہ میں سیاسی کارکن ہوں۔ میں خواب دیکھتا ہوں لیکن میرے خواب سیاسی ہوتے ہیں۔ میں خواب دیکھتا ہوں کہ یہ پاکستان قائداعظم کا پاکستان ہے اور اس کے رہنے والے ایک



دوسرے کے دست و بازو ہیں اور وہ ایک دوسرے کا اور اس ملک کے آئین کا دستور کا احترام کرتے ہیں اور اس ملک میں کسی کو عورت ہونے کی وجہ سے، اپنے کسی عقیدے کی وجہ سے، اپنی ثقافت کی وجہ سے اور اپنی زبان کی وجہ سے محرومی کا احساس نہیں ہوتا۔ انہیں یہ احساس ہو کہ پاکستان میں ان کی سانجھ ہے، ایک ایسا پاکستان، اس کے خواب مت جلیں۔ جب میں تعلیم سے فارغ ہوا تو انسانی حقوق کی تعلیم میں جُٹ گیا۔ ہم سے پہلے والی نسل مطالعہ کی عادی تھی تو ہمارے پاس ایک ذرا تھوڑا سا رسمی طریقہ آ گیا تو میں نے کچھ عرصہ پڑھایا سرکاری محکمہ تعلیم میں لیکن میں نے ایک دو سال کے اندر چھوڑ دیا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ نہیں، یہ میرے کرنے کا کام نہیں۔ لگا نہیں کھاتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ کہ ممکن نہیں ہے کہ وہ استاد بھی ہو اور وہ سیاسی شعور سے عاری بھی ہو۔ استاد آموختہ نہیں بنا سکتا۔ استاد ضلعی مجسٹریٹ کا پریس ریلیز بچوں میں نہیں بانٹتے۔ استاد تو بچوں کو وہ صلاحیت دینے آیا ہے جس سے وہ اپنے سامنے والی راہیں کھول سکیں۔ آنے والی کھڑکیاں کھول سکیں۔ ان کے مقام کا احترام کرنا سیکھ سکیں، اس کے لیے سیاسی شعور چاہئے اور سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تسلسل کے ساتھ سیاست اور سیاست کے ردِ سیاست اُدھار ہیں۔ تو میں کسی فرد، شخصیت یا سیاسی جماعت سے بالاتر ہو کر سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی قسمت سیاسی عمل کے تسلسل میں اور یہاں کے لوگوں کے احساسِ ذمہ داری میں ہے کہ جو سیاسی کام ہے، یہ معاشرے کے ساتھ خلوص پر اور اس کے ساتھ اس کی بھلائی کا واحد رستہ ہے۔ اس سے ہٹ کر کچھ نہیں بنتا تو میں ایک سیاسی کارکن تھا اور کام کرنے کے لیے جو فریم ورک ڈھونڈا، وہ انسانی حقوق کی تعلیم کا تھا تو پرویز مشرف کا عہد آیا، اس میں قانون پڑھنے باہر ضرور گیا، ایک تو یہ کہ انسانی حقوق پڑھتے ہوئے مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ کم از کم مجھے قانون کی سُدھ بدھ ہونی چاہئے۔ کیونکہ انسانی حقوق کی بات، قانون کا نفس، قانون کا منشاء جانے بغیر قانون محض نعرے بازی ہے۔ ادھوری بات ہو جاتی ہے۔ انسانی حقوق کا ایک دھارا جو ہے وہ ہمارے تحت الشعور اور ہمارے تمدن میں بہہ رہا ہوتا ہے لیکن دوسرا حصہ جو ہے اس کا وہ کتابِ قانون، دستور اور قوانین میں ہے اور اس کو جاننا بہت ضروری ہے تو وہ ذرا مشکل وقت آ گیا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں، میں گیا تھا پڑھنے کے لیے، پڑھ لیا، اس کو میں نے استعمال تو نہیں کرنا تھا، لیکن اس سے مجھے یہ فائدہ ہو گیا کہ میں نے جو علمِ مبادیات جسے کہتے ہیں قانون کی انہیں کچھ جان لیا بس پھر وہ ہمارے کام آتا ہے۔



س: آپ نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز انگریزی صحافت سے کیا یا اردو صحافت سے؟

ج: میں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز انگریزی صحافت سے کیا اور ''دی نیوز'' اور ''دی پوسٹ'' میں بالکل ابتدائی سطح پر کام کیا۔ مجھے صرف ادبی ایڈیشن ملا ہوا تھا جو ہفتے میں صرف ایک دن شائع ہوتا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ ادب سے زیادہ اور بڑی تخریب کاری کیا ہو سکتی ہے؟ (تخریب کاری تو میں طنزاً کہہ رہا ہوں۔ ہے تو وہ بھی تعمیر ہی۔ عفاف ایک خاتون ہوتی تھیں ''دی نیوز'' میں انھوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ چونکہ

بھلے ہم نے انگریزی ادب وغیرہ پڑھ بھی لیا ہو، ہم جو قصباتی لوگ ہوتے ہیں، ہماری جھجک نہیں جاتی ہے دماغ سے تو، انھوں نے حوصلہ بڑھایا۔ پھر راشد رحمٰن نے بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

س: اپنے صحافتی کیریئر میں آپ ملک کے تقریباً ہر سرکردہ اخبار کے ساتھ منسلک رہے لیکن روزنامہ ''آج کل'' سے وابستگی کے زمانے میں بہت سے نت نئے رجحانات کو جنم دیا تو وہ تجربہ کیسا رہا؟

ج: دیکھئے بات یہ ہے کہ ''آج کل'' جو روزنامہ تھا وہ جس کاروباری گھرانے کی ملکیت تھا ان کی اصل دلچسپی انگریزی اخبار میں تھی، ''ڈیلی ٹائمز'' میں۔ میری مراد سلمان تاثیر کے گھرانے سے ہے۔ ذرا ہم اپنی زبان میں کہہ لیں ذرا بدیسی تھی اردو اخبار کو وہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کیا ہے؟ لیکن اس اخبار کے اسٹائل کا جو سہرا ہے وہ خالد چودھری کے سر جاتا ہے، وہاں ہمیں ذرا کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ہم نے ''بقیہ'' کا رجحان ختم کیا۔ ہر خبر مکمل خبر کے طور پر چھاپی کہ قاری ایک ہی صفحے پر مکمل خبر کا مزہ لے نا کہ اس کا بقیہ ڈھونڈتا رہے۔ اسی طرح کچھ اور نئے رجحانات کو بھی متعارف کروایا۔ خالد چودھری صاحب اخبار کے ایڈیٹر تھے جبکہ ایڈیشن کا سہرا ندیم رضا کے سر جاتا ہے۔ میں کبھی کبھار مشورہ ضرور دیتا تھا، میں نے ادارتی صفحے کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ اس میں ایک کام جو شعوری طور پر کیا ہم نے۔ ہم نے کہا کہ اخبار کا مطلب ہے کہ یہ پاکستان کے رہنے والوں کا پلیٹ فارم ہے پاکستان میں جو Shade موجود ہیں ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ ہم اس میں سے کسی کو مسترد کریں۔ ہمیں اپنے خیالات کا تبادلہ چاہئے ہاں گالی نہ دیں۔ تفرقہ نہ ڈالیں۔ نفرت نہ پھیلائیں۔ منافرانہ بات نہ کریں۔ کسی کی کردار کشی نہ کریں مجھے یاد ہے کہ نجم سیٹھی صاحب کے ساتھ میرا ایک دو اصحاب پر اختلاف ہوا لیکن ان میں بھی اعلیٰ ظرفی تھی، جب میں نے یہ کہا کہ جی نہیں یہ تو میرٹ پر ہیں تو انھوں نے مان لیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری صحافت کی ساکھ اسی میں ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہمیں اس کا عکس تو دینا چاہیے۔ کیونکہ پڑھنے والا، لکھنے والے سے زیادہ ذہین ہے، وہ جان لیتا ہے، ہم کیوں اس کو آدھی تصویر دیں۔ جو بات یہاں کہی جا رہی ہے، جو مؤقف یہاں پر موجود ہے، پڑھنے والے تک اس مؤقف کو پہنچانا صحافتی ذرائع جو بھی ہوں، اخبار ہو، ٹیلی ویژن ہو یہ ان کا فرض ہے کہ صحیح رخ کہیں۔ کیونکہ یہ عوام، ناظرین اور قارئین کا یہ حق ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان تک درست اور مصدقہ معلومات پہنچائی جائیں۔



س: پھر آپ ''بی بی سی'' سے منسلک ہو گئے اور آپ نے ''بی بی سی'' کی اردو ویب سائٹ کے لیے کئی نامور شخصیات کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے موقع پر Obituaries لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں جیسے معروف شہنائی نواز استاد بسم اللہ خان کا تعزیت نامہ۔ کیسے لکھ لیتے ہیں اتنے دلگیر تعزیت نامے؟

ج: میں عرض کیے دیتا ہوں، ایک تو یہ میری آنکھ جو یہ ذرا آسانی سے نم آلود ہو جاتی ہے اور میرا یہ کہنا ہے کہ ان کا بھیگنا ضروری ہے تاکہ ہم میں دوسروں کے دکھ محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اجازت دیں تو اس

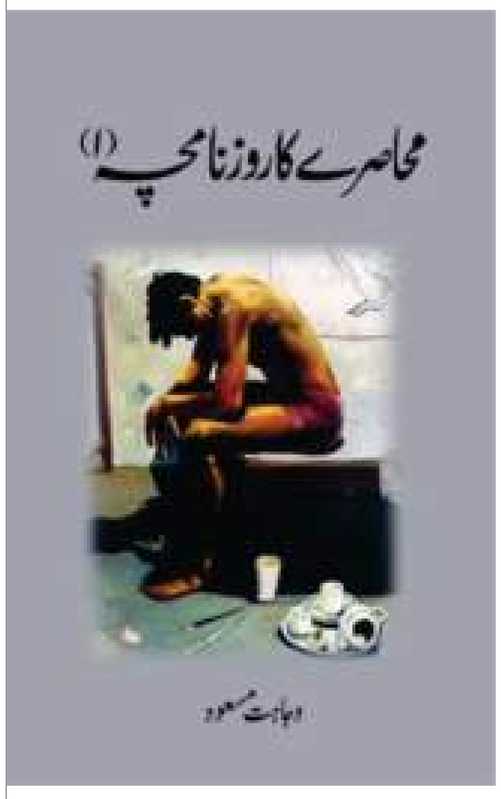
حوالے سے پیش خدمت ہے ساقی فاروقی کا ایک شعر کہ:

؎ یہ کہہ کے ہمیں چھوڑ گئی روشنی اِک رات
تم اپنے چراغوں کی حفاظت نہیں کرتے

اچھا بھیا اگر چراغوں کی حفاظت نہیں کر سکے، ایک تو یہ کہ زندگی ہے تو جو آیا ہے، اس کو جانا بھی ہے لیکن یہ کہ جانے والے کو احترام دینا کہ جو اس نے ہماری خدمت کی ہے جو اس نے ہمیں مالا مال کیا ہے، اس کا احساس بہت ضروری ہے اور پھر میری یہ رائے ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے Obituary لکھنی چاہئے۔ اس میں پڑھنے والوں کو، اس شخص کو جاننے کا اور اس بات کو جاننے کا جو گزرا ہے، ایک روایتی فرد گزرتا ہے روایت نہیں گزرتی ہے، اس کا تسلسل رہتا ہے۔ انسانیت کا تسلسل موجود ہے۔ افراد آتے اور جاتے ہیں۔ اس زمانے میں محمد حنیف ایڈیٹر تھے ''بی بی سی'' کی اردو ویب سائٹ کے جس کا آغاز ۱۹۹۸ء میں ہوا تھا لیکن میں اس سے ۲۰۰۴ء میں منسلک ہوا۔ وہاں مصدق سانول تھے، عارف وقار صاحب تھے وحید مرزا بھارت والے کشمیر سے سری نگر کے تھے، دلی میں تعلیم پائی تھی اور کاٹ دار ذہن کے مالک تھے۔ بات یہ ہے کہ ایک رائیگانی کا احساس تو ہماری نسلوں کے ساتھ چلا ہے نا۔ رائیگانی جو ہے وہ Obituary نہ بھی ہو تو ہوتی Obituary ہی نا، رویا نہ بھی ہو تو اس میں آہ تو آئے گی، تو وہ یہ قصہ تھا۔ یہ دو الگ چیزیں ہیں نہیں۔

س: انسانی حقوق کے حوالے سے ایک مؤقر جریدے ''نوائے انسان'' سے بھی تو آپ منسلک رہے؟

ج: میرا یہ کہنا ہے کہ انسانی حقوق کے لیے معاشرے میں بہتری کے لیے آواز وہیں سے اُٹھے گی جس دل میں سر اُترے گا۔ جس آنکھ میں مصوری ہوگی، رونق دیکھے گی۔ جس کام میں شعر تاثیر پیدا کرے گا، یہ ایک ڈھنگ ہے اگر زندگی کے حسن سے ہمیں شناسائی نہیں ہے تو پھر ہم زندگی میں حسن پیدا کرنے کی طرف مائل کیسے ہوں گے تو ادب انسانی حقوق سے کٹا نہیں اور انسانی حقوق سیاسی شعور سے کٹے ہوئے نہیں ہیں۔ معاشرے میں ایک رائے ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ دنیا میں کہیں بھی انسانی حقوق کی آواز مقبول نہیں ہوتی لیکن انسانوں کے اندر احساس تو ہوتا ہے۔ تین ہزار سال پہلے کنفیوشس نے کہا تھا کہ دوسروں کے ساتھ وہ نہیں کرو جو تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ نہ کیا جائے۔ تو سچ تو یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اسلوب ہیں۔ اچھے ہیں اور دیانت دار ہیں۔ میں انسان کی نیکی کا قائل ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ مختلف محرکات ہو سکتے ہیں جن میں ہمیں انسانوں سے نفرت بھی ہوتی ہے۔ غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم برائی پر بھی مائل ہو گئے اور کی بھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانوں کا جو بنیادی وصف ہے، وہ ان کی نیکی ہے۔ اس نیکی کے نتیجے میں ہم جھگڑوں سے نکل کر تمدن میں آ گئے۔ ہم نے تو جنگل سے شہر کا سفر طے کیا ہے، یہ نیکی کا سفر ہے۔ میری رائے یہ ہے۔



س: کہا جاتا ہے کہ کالم کی زندگی ایک روزہ ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ کے کالم میں مستند حوالے، مصدقہ واقعات اور غضب کی بُنت نظر آتی ہے جو آپ کے کالم کو سدا بہار کالم میں تبدیل کر دیتی ہے اس کا کیا راز ہے؟

ج: آپ کی عنایت ہے، میں شکر گزار ہوں کہ آپ ایسی اچھی رائے رکھتے ہیں لیکن میں شاید اس سے پورا اتفاق نہیں کرتا۔ دیکھئے میں کرتا یہ ہوں کہ ایک تو میرا جو موضوع ہے، اس کی خبر تو اخبار میں صفحۂ اوّل پر آ گئی ۔ادارتی صفحے پر اس خبر کے دوران ورد لا حاصل ہے۔ وہ خبر ہمیں انگیخت کرتی ہے۔ ایک ساز کے تار کو چھیڑتی ہے۔ اس تار سے جو کچھ نکلنا چاہئے تا کہ یہ معلوم ہو جائے پڑھنے والے کو ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہاں پر جو واقعہ ہوا ہے یعنی کہ کسی نے کچھ خاص کہہ دیا ہے، اس کا پس منظر کیا ہے؟ میں اپنی طرف سے پوری ذمہ داری سے کوشش کرتا ہوں کہ جو اگر حوالہ دے رہا ہوں مصدقہ ہوں۔ غلطیاں مجھ سے ہو جاتی ہیں ،ان پر شرمندگی بھی محسوس ہوتی ہو، غلطی انسانوں سے ہوتی ہے، اگر احساسِ ذمہ داری پورا ہو پھر غلطی اس طرح سے نہیں چھپتی۔ پھر سیاق وسباق میں لوگ جان لیتے ہیں کہ یہ بشری غلطی ہے کوئی بد دیانتی نہیں ہے، دانستہ نہیں کی جا رہی۔ لوگ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ معاشرے میں جو احساس کا ارتقاء ہے اس کی عظمت، بلندی اور اس کا ایک وسیلہ جو ہے وہ زبان کا حسن معیاری ہونا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یار یہ تو کچھ اشرافیہ پسند نئی سوچ ہو گی۔ آپ میں یہ خوبی ہوتی ہے کرافٹ اور آرٹس میں کہ اس کی پہنچ جو ہے وہ سب تک ہوتی ہے۔ مجھے اس بات سے غرض نہیں ہے کہ کوئی خاص لفظ پڑھنے والے کو سمجھ آیا یا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کیفیت اس تک پہنچے۔ وہ محسوس کرے بنیادی طور پر جو بیان کیا جا رہا ہے اس میں، میں احسان مند ہوں پڑھنے والے کا کہ تھوڑی سی جو میرے انداز تحریر میں غرابتِ زبان موجود ہے وہ اس کو سمجھ لیتے ہیں کیونکہ کہ اب وہ زبان لکھی نہیں جا رہی۔ لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اسلوب زبان کا اور زبان کا ارتقاء، اپنی سے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھئے ہم وقت کو نہیں روک سکتے۔ ہم ارتقاء کو نہیں روک سکتے۔ ہم نئے معاشرے کو جنم لینے سے نہیں روک سکتے اور نہیں روکنا چاہئے۔ لیکن جو زبان ہے وہ ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اسے ایک دردمندی اور ایک سلیقے کے ساتھ برتیں تو سہی۔ مجھے پسند ہے چراغ حسن حسرت صاحب کا لہجہ۔ مجھے پسند ہے کہ اگر اداریہ لکھا جا رہا ہے تو وہ غلام رسول مہر صاحب کی طرز کا ہو۔ جو ہمارے چراغ جلانے والے تھے مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ جو ایک خیال تھا کہ اس کی تاثیر جو ہے وہ عوام تک نہیں پہنچ پائے گی۔ ایسا نہیں ہوا۔ پاکستان کے لوگ ایک سو چالیس برس کی سیاسی تاریخ رکھتے ہیں۔ میں جدید سیاست کی بات کر رہا ہوں۔ تمام نو آبادیوں میں سب سے پہلے آزادی کا مطالبہ کرنے والے اسی زمین اور خطے کے لوگ تھے اور ہمارا ایک اردو دان بھی اگر لے لیں تو وہ ساڑھے تین سو برس سے زیادہ تو اس کا حصہ ہے لیکن کیا ہم حافظ کو، خیام کو اور سعدی کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کیا ہم عربی شاعری کو اپنے آپ سے کاٹ سکتے ہیں؟ کیا جو بلاغت وفصاحت قرآن میں ہے اسے ہم اپنی اساس سے



الگ کر سکتے ہیں؟ نہیں کر سکتے اور کرنا بھی نہیں چاہئے۔ جب ہم کریں گے تو خود کو غریب کریں گے تو بھیا وہ دوست لوگ جس لب ولہجہ میں بات کہنا چاہتے ہیں، بسم اللہ وہ کہیں۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر جو لکھنے والے پسند ہیں، ان میں وسعت اللہ خان صاحب ہیں، خورشید ندیم صاحب ہیں جو ہلکا پھلکا لکھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بڑی بُنت میں لکھتے ہیں۔ یاسر پیرزادہ کو اس میں شمار کرتا ہوں پھر منو بھائی اور انتظار حسین۔ میرا یہ خیال ہے کہ دیکھئے انتظار صاحب نے اپنے کالموں میں ساٹھ برس کی ہماری جو تہذیبی وتمدنی تاریخ ہے اس کو دستاویز کیا ہے۔ ہمارا بھلے وہ معیار وہاں تک نہیں پہنچ پایا، ہماری کاوش، اصلی رنگ میں چاہے وہاں تک نہیں پہنچ پائی لیکن آرزو کرنے میں کیا حرج ہے اور سعی کرنے میں کیا حرج ہے؟

س: آپ کے کالمز کے زیادہ تر موضوعات سیاسی میدان میں رونما ہونے والے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں یا پھر کبھی کبھی آپ ثقافتی موضوعات میں بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کالمز پر ادبی رنگ کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں لیکن آپ خود کن موضوعات کو زیرِ بحث لانا زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج: نہیں یہ ایسا ہے نہیں بابو! میرے خیال میں اس میں ہمارے ہاں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ثقافت ہے کیا؟ کوئی Given Wisdom کا نام تو نہیں ہے۔ کلچر جو ہے Cultivations سے آیا تو اسے تو مسلسل کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ میرے لیے سیاسی بات میں، ادبی بات میں، ثقافتی موضوعات پر اور سماجی جو ڈھانچے ہیں وہ اقدار ہیں۔ اس میں فرق نہیں ہے۔ میری بلکہ میری تو یہ خواہش ہے کہ ہم ان ساروں کو ایک مجموعی تصویر میں دیکھنا سیکھ سکیں۔ بطور ایک قوم کے اگر ہم وہاں تک پہنچ پائے یا پہنچتے ہیں تو میری رائے میں وہ ایک اچھا پہلو ہوگا۔ میں تو قطعاً نہیں سوچتا کہ آج ہم نے صحافت پر لکھنا ہے اور آج ہم نے انسانی حقوق پر لکھنا ہے اور آج ہم سیاست پر لکھیں گے۔ نہیں یہ سب ایک ہیں۔ شعر سے بڑی سیاست کیا ہوگی؟

س: آپ ایک ویب سائٹ ''دنیا پاکستان'' سے بھی منسلک رہے اور اس کے بعد آپ نے اپنی ویب سائٹ ''ہم سب'' کا آغاز کیا جس نے بہت جلد ملک کی صفِ اول کی ویب سائٹ کا اعزاز حاصل کیا؟ اس ویب سائٹ کے قیام کا خیال کیسے آیا؟

ج: وہ جس طرح سے رونامہ ''آجکل'' میں، میں نے سیٹھی صاحب والا تجربہ عرض کیا نا، ''دنیا پاکستان'' ایک ویب سائٹ تھی، اس میں رہا تو وہاں پر وہی اختلاف ہوا کہ انہوں نے کہا کہ یہ والا رنگ ڈالا جائے اور یہ والا رنگ نکالا جائے تو ہم نے کہا دیکھئے یہ پاکستان ہے اور ہم اپنے ملک کے بارے میں اچھا سوچتے ہیں اور ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کے لوگ اس ذہانت اور اس صلاحیت سے مالا مال ہیں اور جو رائے جسے کہنا چاہئے کہ وہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ وہ نئے راستے اور بہتر راستوں کی تلاش کر سکتے ہیں انہیں



وسعت اللہ خان

Given Perspective کے آموختے پر نہیں رکھ سکتے لڑائی وڑائی کا تو ہمارا کام ہی نہیں ہے۔ اختلاف ہوگئے تھے تو انھوں نے کہا کہ الگ ہو جاتے ہیں پھر ہم نے سوچا کہ بھیا ہم نے اب کوئی ویب سائٹ شروع کرنی ہے۔ آتا جاتا ہمیں کچھ نہیں جو آج کل کی ٹیکنالوجی ہے اس کی سمجھ نہ تھی۔ ہمیں یہ احساس نہ تھا کہ ساتھ میں اتنی بھاری ذمہ داری بھی آجائے گی۔ اب سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ایک تو ان گنت نئی، پہلے سے گمنام خواتین نے وہاں پر لکھنا شروع کیا، وہ اتنی مستند آواز کے ساتھ آئیں کہ اس میں اتنا وزن ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی اچھا ہو گیا۔

س: ''ہم سب'' پر خاص طور پر آپ نے خواتین قلمکاروں کے ایسے موضوعات پر مضامین شائع کیے جن کو عام طور پر معاشرے میں زیرِ بحث نہیں لایا جاتا اور یوں آپ نے ایک نئے رجحان کو متعارف کروایا اس کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

ج: بات یہ ہے کہ معاشرہ جو ہے وہ ایک دھارا ہوتا نہیں ہے۔ معاشرہ Monolith نہیں ہے، ایک پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ معاشرہ جو ہے وہ ایک سیال چیز ہے، اس میں Fluid ہوتے ہیں، اس میں دھارے ہوتے ہیں وہ چل رہے ہوتے ہیں۔ جو بری ریاست ہے یا برا معاشرہ ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا ایک ہی رنگ ہو۔ یک رنگی کمزوری ہے اور تنوع توانائی ہے اور پھر جو ہم نے ایک شعوری کوشش کی۔ ہمارے وہ علاقے جہاں کے لوگوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ شاید پاکستان میں ان کی آواز یا ان کے دکھ یا تکلیف کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ لہٰذا مضافاتی یا دُور افتادہ علاقے جیسے گلگت بلتستان، بلوچستان، اندرونِ سندھ اور جنوبی پنجاب سے مجھے خاص دلچسپی رہتی ہے کہ اقلیتی دوست، اقلیتی شناخت کے ساتھ اس وطن کی ملکیت کے حساب سے پاکستانی ہونے کی شناخت سے بات کریں۔ یہ کیا سلسلہ ہوا کہ اگر کسی کا تعلق مسیحی یا ہندو برادری سے ہے تو وہی لکھے گا اقلیتوں پر اور ہم صرف کہیں گے کہ خاتون ہی ہو جو عورتوں کے مسائل پر لکھے گی۔ ہم نے درجہ بندی ہی ختم کر دی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عورتوں کے حقوق جو ہیں، یہ کوئی چیز نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق جڑے ہوئے ہیں، یہ صنف کا سوال ہے۔ یہ کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے اور جمہوریت میں بھی اقلیت اور اکثریت جو ہے وہ صرف ایک طریقے کی بات ہے جو اصول ہے وہ برابری ہے وہ مساوات ہے، اور اس طرح کی باتیں ہونا اچھا ہے۔



س: آپ کے ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ آپ ''ہم سب'' پر کمزور تحاریر کو تصاویر کے ذریعے مقبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں؟

ج: جی ہاں میں کرتا ہوں اور شعوری طور پر کرتا ہوں۔ (ہنستے ہوئے) دیکھیے بات یہ ہے کہ یہ کیا بات ہوئی کہ میں کہوں کہ صرف میرے سمو سے ہی اچھے ہیں تو I should be no principled that بات یہ ہے کہ وہ بچے جو نئے لکھنے والے ہیں، نو آموز ہیں، اگر تھوڑا کمزور بھی لکھتے ہیں تو ان کی تحاریر کو پڑھنے

کے قابل بنانے کے لیے تصاویر بھی لگائی جاتی ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ آپ شاید تھوڑا ہچکچا گئے ہیں کوئی بات کہنے سے، بہت سے ایسے موضوعات ہیں جنھیں ہمارے معاشرے میں صحافت کے لیے ایک مناسب موضوع نہیں سمجھا جاتا بلکہ شجرِ ممنوعہ لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ A valid question and where is a valid question every where۔

جہاں تک انسانی ارتقاء آیا ہے وہاں تک ہمارے معاشرے میں بسنے والوں کا بھی حق ہے۔ جن سوالات پر غور کریں، بات کریں اور ہم ان کو ڈبے میں بند کر کے نہیں رکھ سکتے تو وہ اس کو کوئی درجہ بندی وغیرہ کے لیے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ صحافی پیسے لے کر لکھتے ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ اچھا اگر صحافی پیسے لے کر نہیں لکھے گا تو روٹی کیسے کھائے گا۔ یہ تم آج کیا الزام لگا رہے ہو بھائی؟ جس طرح سے میں ایک جوتے بنانے والے اور کپڑا بنانے والے کا شکر گزار ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صحافی کوئی اجارہ دار نہیں ہے وہ انتخابی طاقت نہیں ہے وہ سیاست میں فریق نہیں ہے لیکن وہ اپنے معاشرے کی بہتری کا اسٹیک ہولڈر ہے۔ صحافی اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس کو کچھ اور کام کرنا چاہیے۔

س: اگر ہم ملکی صحافتی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو آپ مختلف ادوار میں روا رکھی جانے والی سنسر شپ کا کیسے تجزیہ کریں گے؟

ج: اس میں دو پہلو ہیں۔ جب ہم لوگوں نے اپنے شعور کی آنکھ کھولی تھی تو ہم نے دیکھا کہ آدھا آدھا صفحہ خالی ملتا تھا، کئی دفعہ اس سے بھی زیادہ ہوا ہے کہ پورے صفحے پر ایک ہی خبر ہے۔ ایک چھوٹی سی خبر بچی ہے باقی سب اڑا دی ہے۔ آج بھی وہی صورت ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہاں خالی جگہ پر بے معنی لفظ لکھے ہیں جو بنیادی سوال نہیں اٹھاتے جو معاشرے میں شعور پیدا نہیں کرتے بس صفحے کا پیٹ بھرنا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ صفحہ کالا کرنے سے بہتر ہے کہ ایک اور محاورہ اردو کا وہ کر لیا جائے۔ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے آپ؟۔ ایک تو یہ قصہ ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ جو معاشرہ کے مقتدر طبقات ہیں، انھیں مسئلہ اخباری ادارے کی دولت سے یا مالک کی دولت سے نہیں ہے انھیں مسئلہ صحافی کی اس حِس سے ہے کہ وہ کرید رکھتا ہے۔



س: مسئلہ یا خطرہ؟

ج: دونوں باتیں یا خطرہ کہہ لیجئے۔ یوں کہہ لیجئے کہ انہیں زحمت جس سے ہوتی ہے وہ ورکنگ جرنلسٹ سے ہے اور سیٹھ سے انھیں کوئی مسئلہ نہیں ہے اور پہلے جب ہمارے پاس ڈیڈ لائن ہوتی تھی، فعال، متحرک آپ کو پتہ ہے، ہم نے بہت اچھے سلیقے سے سوچ سمجھ کر ٹریڈ یونین بھی ختم کی، طلباء یونین بھی ختم کی۔ ہم نے اس ملک میں ساکھ ڈبوئی، بہت سے تمدنی اداروں کی اور اب یہ ہے کہ صحافت اپنی حرمت کھو بیٹھی ہے اور جو صحافی جس کا دامن تھوڑا بہت صاف ہے، اس کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ یہ بلیک میلر ہے۔

بدقسمتی سے اس کے کئی شواہد بھی تو موجود ہیں نا۔ اگر صحافی کا مؤقف جو ہے وہ اسٹاک ایکسچینج کی طرح بدلنا شروع ہو جائے، اس میں اونچ نیچ آنی شروع ہو جائے اور وہ وقت کی رفتار اور اقتدار کی رفتار سے بھی ہم آہنگ اگر ہو تو جناب وہ تو طاقت جس کے ہاتھ میں ہو اس کا ہاتھ پڑھ لیا۔ بہت سے ایسے شعبے ہیں، اس سے پڑھنے والے کا ایمان اٹھ جاتا ہے This is not for journalism

س: آپ کی تحریریں ہمیشہ معاشرے میں امید کی کرن کا باعث بنتی ہیں لیکن اگر ہم فنونِ لطیفہ کی مختلف اصناف کا جائزہ لیں چاہے وہ ادب کا میدان ہو، کھیل کا میدان ہو، فنِ موسیقی ہو جو چراغ بجھتے جا رہے ہیں ان کی جگہ کوئی لینے والا نہیں۔ آپ اس کی وجہ کیا سمجھتے ہیں؟

ج: ہمارے بہت ہی اچھے شاعر محمد انور خالد 2004ء میں انتقال کر گئے۔ چھوٹی عمر تھی۔ باون برس کے تھے، ان کی ایک نظم کی چند لائنیں سنیے:

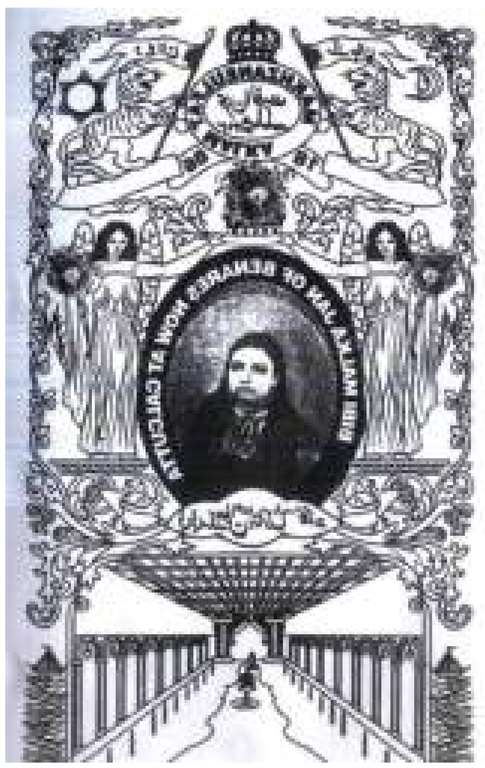
پہلے ہر شہر میں کچھ لوگ ہوا کرتے تھے

اب آگے چل کر کہتے ہیں

اب بات یہ ہوئی کہ

''اب کہیں کوئی دھوپ سے رنگ اڑا جاتا ہے میدانوں کا''

بات یہ ہے کہ اب جو مشکلات اور بحران ہیں وہ عارضی ہیں۔ انسان کا امکان مستقل ہے ہم نے انسان اور انسان کے خواب جو ممکنہ استعداد ہیں ان سے امید رکھی ہے۔ ہم انسان کو بنیادی طور پر نیک سمجھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انسان بنیادی طور پر تخریبی ذہن رکھتے ہیں یا ناانصافی کی طرف مائل ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ ناانصافی سے ناانصافی جنم لیتی ہے۔ انصاف ہے کیا؟ یہ کہیں الماری میں نہیں رکھا۔ یہ مسلسل توازن، زیادہ مساوی یا منصفانہ توازن کی تلاش کا نام ہے تو قانون جو ہے وہ کوئی اس طرح کے مبسوط چیز نہیں جیسے مستقل رہے۔



س: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تفریحی شعبوں میں جدید ٹیکنالوجی کے باعث ایک انقلاب برپا ہوا ہے لیکن کیا آپ ثقافت کے فروغ کے لیے قائم مختلف ثقافتی اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج: اس میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا، قومی تعمیر کا جو بنیادی نصب العین ہے اس میں ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں اور اس میں ہم سب ذمہ دار ہیں جہاں تک ٹیکنالوجی کا تعلق ہے، میں آپ سے عرض کروں کہ اس نے تو ہمارا کام آسان کیا بلکہ میری کم از کم رائے میں ہماری جو اصل موسیقی ہے۔ اس کو کم از کم سو برس ہونے کو ہیں۔ آج اس ٹیکنالوجی کی بدولت آپ استاد عبدالکریم کو بھی جانتے ہیں۔ آپ گوہر جان کلکتے والی کو بھی جانتے ہیں، آپ پنکج ملک کو بھی سن سکتے ہیں۔ کے سی ڈے کو بھی سن سکتے ہیں اور اگر آج بھی اردو زبان ٹوٹی پھوٹی اگر ہے، اس میں سلاست یا فصاحت کی کمی ہے، اس میں لفظوں کا تنوع کم ہے۔ لوگوں کی

لغت وسیع نہیں ہے وہ اظہار ٹھیک نہیں کر پا رہے اگر ہمارے تعلیمی نظام کی کچھ کمزوریاں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہمارے لوگ باصلاحیت نہیں ہیں۔ یہاں مسئلہ ٹیکنالوجی کا نہیں ہے آج مواقع بھی پہلے سے زیادہ ہیں۔ دیکھئے خبر انسانوں کی طاقت ہے۔ کتاب میں چھپنے والا حرف جو ہے اس نے صنعتی انقلاب کو جنم دیا ہے۔ جس کو جدید دور کہتے ہیں یا جسے نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں، یہ گوئٹن برگ کے چھاپے سے نکلے ہیں تو لفظ پہلے سے موجود تھے۔ پھر اسی طرح برصغیر میں بھی فورٹ ولیم کالج کے دور میں چھاپہ خانہ آیا جس کے ذریعے ہم نے ولی دکنی کو بھی دریافت کیا۔ ہم نے امیر خسرو کو بھی دریافت کیا۔ ہم نے میر تقی میر کو بھی دریافت کیا۔ لیکن اگر ٹیکنالوجی نہ ہوتی تو ہم ان سب کو بھول گئے ہوتے۔ ٹیکنالوجی سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ بلکہ ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جو ٹیکنالوجی کو پیدا کرتا ہے جو علم کی تخلیق ہے ہم اس میں حصہ دار بنیں ورنہ ہم ہمیشہ مقروض ہی رہیں گے۔

س: آپ بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے حوالے سے کیا خیال رکھتے ہیں؟

ج: اس حوالے سے تھوڑا سا میرا خیال عام طور سے تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ اس میں میری رائے متنازعہ ہے۔ میرا یہ کہنا ہے کہ زبان میں تعلیم جو ہے ٹھیک ہے۔ مادری زبان کا ایک درجہ ہے اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم کسی زبان کو گھٹیا یا کسی زبان کو برتر نہیں سمجھتے لیکن اردو سمیت ہماری مقامی زبانوں میں کچھ چیزیں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر جو ہم عصر تحقیق ہے جو مجموعہ علوم ہے جو ہم عصر مطالعات ہیں۔ ہماری زبانوں میں ان کا ذخیرہ نہیں ہے تو اس میں ہم مجبور ہیں اور دیکھئے یہ اس طرح سے بات نہیں چل سکتی۔ یہ ایک مخصوص طبقے کے لوگ جو ہیں وہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں اور وہ بلند ترین جو سطحیں ہیں، ممکن وہاں تک پہنچیں اور باقی ہم سب کو وہ پیشہ وارانہ تعلیم کے ذریعے، ترکھان اور لوہار بنا کر رکھنا ہے۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے جس میں ایک اشرافیہ اور ایک اہل ارفع ہوگی۔ کچھ اشراف ہوں گے اور کچھ اطلاف ہوں گے۔ ایسا پیمانہ نہیں ہے۔ ہر بچے یا بچی جب پیدا ہوتی ہے، اس کی صلاحیت، رتبہ اور حقوق ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں نہیں طے کرنا چاہئے کہ انہوں نے کہاں تک پہنچنا ہے۔ یہ ان کی کارکردگی بتائے گی کہ انھوں نے کہاں تک پہنچنا ہے۔، اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں انگریزی زبان ہی بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ کیونکہ یہ صرف انگریزی کا مسئلہ نہیں ہے وہ دوسری زبان میں بھی مثلاً یہ کہ وہ زبان جس کا ابلاغ کا Gap جو ہے وہ نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ نہ ہو۔ ہمارا ہے، ہمارے پورے Orient کا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد پر ایرانی اثرات تھے یا مغل یا خلافتِ عثمانیہ یا پھر چین کے تھے ان کا Break ہے۔ پندرہویں صدی میں سولہویں میں یہ پیچھے رہے ہیں۔ یہ کوئی دو تین سو سال پیچھے گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں آج جہاں بھی بہتری نظر آ رہی ہے۔ ہمیں احسان مند ہونا چاہئے کہ ہمارے بزرگوں نے اور ہمیں نو آبادیات Benine ملے تھے۔ ہم ولندیزیوں اور فرانسیسی کے محکوم نہیں تھے۔ ہم نے میز پر بیٹھ کر آزادی لی ہے۔



س: آپ روزنامہ ''جنگ'' میں ''تیشۂ نظر'' کے نام سے کالم لکھتے ہیں مگر آپ نے کالموں کا مجموعہ ''محاصرے کا روزنامچہ'' کے عنوان سے شائع کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: بوجوہ اس کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔ (ہنستے ہوئے) ریڈیو پاکستان پر بوجوہ قاصر ہوں۔

س: آپ نے ابتداء میں فرمایا کہ آپ کو زمانہ ءطالبعلمی میں بہت شفیق اور قابل اساتذہ میسر آئے لیکن آپ نے خود بہت قلیل عرصہ درس وتدریس سے منسلک رہے اس کی کیا وجہ تھی؟

ج: تعلیم صرف کمرۂ جماعت تک محدود نہیں ہے۔ آج کل میں یونیورسٹی بچوں کو پڑھانے جاتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس بات سے کوفت ہوتی ہے کہ میں بطور استاد کے کسی کی تعیناتی یا تقرری یا کسی انتظامی مسئلے کے حل کے لیے کوشاں رہوں۔ ایک استاد کے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جو باقاعدہ استاد ہیں، کام ان کا بھی یہی ہے کہ وہ تحقیق کریں۔ وہ معاشرے کی تعمیر میں نہ صرف حصہ ڈالیں یہ جو ہم کمرۂ جماعت میں جا کر بچوں سے بات کرتے ہیں یہ تو ایک by product ہے اور یہ کام تو اسکول کے اساتذہ کا ہے کہ بچوں کو خواندگی کی مہارتیں دے دیں یہ تو ایک طرح سے فیکلٹیز کو تنقیدی طور پر کو بیدار اور متحد کرنا ہے یہ جامعات کا کام ہے کیونکہ ایک سادہ سے سادہ اصول ہے کہ جو بھی کسی چیز کی افادیت ہے اسے خارج نہیں ہونا چاہئے ہمارا تو تعلیم کے فروغ کا ہی کام ہے وہ اخبار کی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ کمرۂ جماعت میں کیا جا رہا ہے۔ صرف یہ ہے کہ میں ایک باقاعدہ طور پر کسی درسگاہ سے وابستہ نہیں ہو رہا اور مجھے اس کی کوئی خواہش بھی نہیں ہے کہ مجھے انتظامی امور ملیں۔ میرے میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔

س: کن نابغہ ءروزگار شخصیات سے آپ نے اپنی عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کی؟

ج: ان گنت، اس میں تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب تو کوئی ہوگا نہیں۔ پاکستان کے بہترین دماغوں نے مجھے اپنی شفقت وحمیت سے نوازا۔ ملتان سے قسور گردیزی صاحب، لاہور سے ڈاکٹر مبشر حسن، پشاور سے افراسیاب خٹک، سندھ سے غوث بخش بزنجو صاحب ان کا آخری وقت تھا، میری نوجوانی تھی۔ مجھے بہت عمدہ اساتذہ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں ملے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے کئے سے زیادہ نوازا گیا میرے پاس تو سوائے تشکر کے اور کچھ نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسے شاندار لوگوں سے جو ملنا تھا وہ بذاتِ خود زندگی کا ایک احسان ہے۔ ان گنت نام ہیں، میں نے کچھ نام لے دیے لیکن یہ کہ بہت سے ادیب، شاعر، اساتذہ اور سیاسی رہنما ہیں اور مجھے ان میں کوئی کینہ، بغض اور کوئی خفت نہیں ملی۔ کوئی بات کو روک کر رکھنے والا معاملہ نظر نہیں آیا۔ ہمارے لوگ بہت وسیع قلب کے ہیں۔



ڈاکٹر مبشر حسن

س: آپ کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے وہ کون سی شخصیات ہیں جن کی آپ کو اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی بہت شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج: میں نے عرض کیا تھا کہ ''تم اپنے چراغوں کی حفاظت نہیں کرو گے''۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں انتظار

صاحب کے جانے کا سوچتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انتظار صاحب کے جانے سے ایک عہد تمام ہوا ہمارا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اب ہمارے پاس اس طرح کے اس سطح کے تربیت یافتہ سیاسی کارکن نہیں آ رہے۔ کئی سیاسی جماعتیں اس طرح کے بحرانوں سے گزری ہیں کہ کارکن کی تربیت والا کام پیچھے چلا گیا اگر روز بروز بحرانوں نے ہی جنم لینا تھا تو بقاء کا سکہ بن گئے۔ ان کی بقاء پر ہی سوالات آ گئے تو روایت کیسے چلے گی۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، استاد، سیاسی کارکن اور فنکار۔ اصل معاشرے کا اثاثہ یہی ہیں۔ اسی سے قیادت نے آنا ہے، اسی سے آئندہ کی راہیں اور انسانوں کی آسودگی کا سامان پیدا ہو جائے گا۔

س: فنِ موسیقی میں کون سی صنف زیادہ پسندیدہ ہے؟

ج: ٹھمری، خیال کبھی Nostaljia ہو جائے تو فریدہ خانم کی گائیکی پسند ہے میں لوک گیت بھی سن لیتا ہوں لیکن اس ضمن میں تھوڑا زیادہ Selective ہوں۔ میں ہر چیز نہیں سن سکتا۔

س: تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موسیقی کی پسند کے حوالے سے آپ کا معیار بہت بلند ہے؟

ج: نہیں نہیں معیار کا بلند ہونا نہیں ہے۔ بھائی مزاج کی باتیں ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس چیز میں مجھے مزہ نہیں۔ میرے مزاج سے ایک چیز لگا نہیں کھاتی۔ میں جے جے ونتی نہیں سن سکتا۔ میں دن رات میں کسی وقت بھی جونپوری سن سکتا ہوں مجھے بھیرویں پسند ہے۔ مجھے کافی پسند ہے تو وہ میں سن لوں گا۔ کچھ چیزیں نہیں پسند مثلاً میں جھنجھوٹی نہیں سن سکتا۔ میری وہ حس بیدار نہیں ہوتی یا جگل بندی کا مزہ الگ ہے سو وہ بسم اللہ کریں۔ اگر نزاکت حسین اور گرجا دیوی آمنے سامنے پھر تو کیا بات ہے۔

س: اپنی زندگی میں کتنی مرتبہ عشق کی واردات کے تجربے سے گذرے؟

ج: عشق کرنے والے عشق کے بارے میں بات نہیں کرتے۔ اس پر بات کرنا بیکار ہے، میں اندر کی دولت دیکھتا ہوں۔ یہ ہماری اپنی سرمایہ کاری ہے۔



س: میں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ شاید کسی اور کی اس میدان میں رہنمائی ہو جائے؟

ج: اس طرف بھی تشکر ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ والا جو انسانی زندگی کا پہلو ہے اس میں بھی تین نکات بنیادی ہیں۔ ایک معیار، عزت اور دیکھ بھال اور میں اس میں خوش نصیب رہا۔ میری کوئی محرومی اس حوالے سے زندگی میں نہیں ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں admits finnest characters possible جو مجھے زندگی کے اس پہلو سے بھی کوئی شرمندگی یا محرومی کا احساس نہیں۔

س: جب آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی ملنے کی اطلاع ملی تو آپ کا پہلا ردِعمل کیا تھا؟

ج: مجھے تو اپنے آپ سے پوچھنا پڑ رہا تھا کہ کیوں دیا ہے بھئی؟ وہ قصہ یہ ہے کہ میں گاڑی میں جا رہا تھا۔ گاڑی تو مجھے چلانا نہیں آتی۔ تو ہمارے ڈرائیور شیر خان صاحب وہ گاڑی چلا رہے تھے وہ گاڑی چلانے میں بھی وہ خود مختاری کے قائل ہیں۔ تو مجھے قاسمی صاحب کا فون آیا اور انھوں نے بتایا، میری آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ میں نے کہا بھئی اس میں تشکر کا ایک پہلو میرے لیے بہت اہم تھا کہ میں نے جو زندگی میں مؤقف اپنایا تھا وہ منظور شدہ یا توثیق شدہ موقف نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے کا غیر مقبول موقف ہے تو ریاست کی طرف سے اس کو تسلیم کیا جانا، میں سمجھتا کہ ہماری ریاست اصل میں یہ اشارہ دے رہی ہے کہ یہ بھی ایک درست مؤقف ہے۔ اگرچہ میں دوسرے کے مؤقف کو زیر بحث نہیں لاتا تو لیکن میرا مؤقف تو مجھے عزیز ہے نا۔ ٹھیک ہے نا مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے۔ میرے خیال میں مجھے یہ اعزاز وقت سے پہلے مل گیا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی ایسا کام کیا ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں میرے سے زیادہ بہتر کام کرنے والے، میرے سے زیادہ محنتی اور میرے سے زیادہ ذہانت رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔

س: آپ کے اب تک کالمز کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج: جی بالکل، وہ ایک ادارے نے کہا ہے کہ میں پانچ جلدیں شائع کرنا چاہتا ہوں انتخاب کی، تو تیسری اب پریس میں ہے، دو آ گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اے اس کو ایک طرح سے دستاویز کیا جا رہا ہے۔

س: گذشتہ چند برسوں سے ملک کے طول و عرض میں ادبی میلوں کا چلن عام ہے کیا آپ اس کو ادبی سرگرمی سمجھتے ہیں یا کاروباری سرگرمی؟

ج: کاروباری سرگرمی نہیں ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس میں ایک فائدہ ہوتا ہے وہ یہ کہ ہمارے جو نوجوان ہیں، انہیں یہ معلوم ہو کہ تخلیقی سفر میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور لفظ کی حرمت کے کیا معنی ہیں؟ یہ ایک وقیع سرگرمی ہے، یہ ایک وقعت والا کام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ شاعر وہ ہوتا ہے کہ جس نے زیادہ بال بکھیرے ہوں جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوں جو کہ بے حال ہو، جسے معاشرے نے نظر انداز کر دیا ہو۔ ادبی میلوں کی روایت کو میں اچھی روایت سمجھتا ہوں۔ معاشرے اور زمانے کے ڈھنگ ہوتے ہیں۔



اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں منعقدہ پہلے بہاول پور لٹریری اینڈ کلچرل فیسٹیول کے موقع پر
وائس چانسلر انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب سے یادگاری شیلڈ وصول کر رہے ہیں (مارچ ۲۰۲۰ء)

معاشرے کی بھی تو روایت تھی نا۔ کیسے پتا چلتا لکھنؤ والوں کو کہ میرؔ صاحب آئے ہیں، اگر مشاعرہ ہی نہیں ہو رہا، سرائے میں اترے اور سوال ہی کیا کہ میاں کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے ادھر؟ انہوں نے کہا کہ جی ہو رہا ہے پہنچ گئے۔ تو لوگوں کو پتہ چل گیا کہ وہ کس دیار سے آئے ہیں۔

س: آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ، مشاہدہ اور حافظہ مثالی ہے دن میں کتنے بادام کھاتے ہیں؟

ج: (ہنستے ہوئے) زیادہ تو کڑوے ہی ہوتے ہیں

س: آپ کا کتب خانہ بھی بہت وسیع ہے کتنے عرصے سے کتابیں جمع کر رہے ہیں؟

ج: کوئی بیالیس تینتالیس برس ہو گئے۔

س: کچھ یاد ہے کہ بچپن میں پہلی کتاب کب خریدی اور سنا ہے کہ آپ اپنے کتب خانے کو اپ ڈیٹ کرتے رہتے ہیں؟

ج: میں اس میں سے کتابیں نکالتا رہتا ہوں کیونکہ جگہ ہی نہیں ہوتی اور پھر یہ کہ مجھے کتابیں عزیز بہت ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کتنے کھانے چھوڑ کر فلاں کتاب خریدی تھی اور میں ہر کتاب کے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ یہ فلاں دوکان سے فلاں وقت میں خریدی۔ فلاں جگہ پر بیٹھ کر خریدی تھی۔ فلاں ضرورت کو پورا یا ادھورا چھوڑ کر یہ خریدی تھی۔ میں کرتا یہ تھا کہ چونکہ کتابیں چوری کرنے کا مجھے ہنر نہیں آتا تھا اور میرے پاس پیسے بھی نہیں ہوتے تھے تو کتاب کو الٹی کر کے رکھ دیتا تھا تا کہ کسی کو نظر نہ آئے کہ یہ کونسی کتاب ہے جب پیسے ہو گئے تو وہ جا کر خریدی۔ یعنی میں نے اپنی کتابوں کو نشان زدہ کر رکھا تھا کہ عید آنے والی ہے، عیدی ملے گی پھر جائیں گے اور کتابیں خریدیں گے تو عید کے بعد جب پہلی دفعہ دوکان کھلی اور دوکاندار دوکان کھولنے کے لیے آیا تو میں اس کی بند دوکان کے باہر کھڑا تھا۔

س: آپ کے کتنے بچے ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں؟

ج: میرے دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ دونوں اپنی دنیا میں ہیں۔ بیٹا ہوٹل مینجمنٹ میں چلا گیا اور بیٹی تاریخ پڑھ رہی ہے مجھے اس سے کافی اچھی اُمیدیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ ذمہ دار شہری ہے بیٹے سے بھی مجھے کوئی گلہ نہیں، وہ بہت اچھا ہے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ جو اجتماعی زندگی ہے اس کے حسن میں اگر ہم اپنا حصہ نہیں ڈالیں گے یہ جو روزمرہ کے صبح ۹ بجے سے شام ۵ بجے تک والے کام ہیں ان کو میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ پھر یہ ہے کہ میرے بچے کسی کو نقصان نہ پہنچائیں اور میرا بیٹا ایسا نہیں ہے مجھے بخوبی اس پر پورا بھروسہ ہے۔



س: سنا ہے ایک مرتبہ جب آپ اور آپ کی اہلیہ لاہور میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے نکالے گئے جلوس میں شریک تھے تو جب پولیس نے لاٹھی چارج شروع کیا تو آپ نے اپنی اہلیہ کو بچانے کی بجائے راہِ فرار اختیار کی؟

ج: نہیں میں بھاگتا نہیں تھا۔ (ہنستے ہوئے) میں ڈاکٹر مبشر حسن کی حفاظت کر رہا ہوتا تھا ایک طرف کھڑا ہو کر ۔ایک دفعہ یہ ہوا کہ جب زیادہ مار پڑ رہی تھی انہوں نے کہا کہ تم ادھر کیوں کھڑے ہو؟ تو میں نے کہا کہ میں ڈاکٹر صاحب کی حفاظت کر رہا ہوں دیکھ تو رہے ہو۔

س: تو کیا آپ کو اپنی بیگم سے پیار نہیں تھا؟

ج: نہیں پیار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بھئی سادہ سی بات ہے کہ مجھے لڑائی بھڑائی آتی ہی نہیں ہے۔ میری چھوٹی سی تلخ بات بھی ہو جائے تو اس کی بدمزگی میرے منہ میں کئی دن تک رہتی ہے۔ وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ کوئی گالی دے۔ اگرچہ گالیاں بہت پڑتی ہیں۔ اس دور سے دشمنان میں کمی آنے والی تو نہیں ہے لیکن یہ کہ میں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا کیونکہ آپ اس پر جتنا غور کرتے ہیں نا تو آپ کے اندر کڑواہٹ بھرتی چلی جاتی ہے تو اس سے امکان range پرواز میں کمی آجاتی ہے۔ اور اس پر زیادہ توجہ ہمیں دینی چاہئے۔ وہ صرف اتنی سی بات تھی ورنہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے مشہور زیادہ ہو گیا۔ ایک ہی دفعہ ہوا تھا۔ ہنستے ہوئے) میں واقعتاً ڈاکٹر صاحب کو لے کر ایک طرف ہوا تھا۔



وجاہت مسعود اپنی اہلیہ تنویر جہاں کے ہمراہ

س: آپ کا طریقۂ مطالعہ کیا ہے؟ کیا بیک وقت بہت سی کتابیں زیرِ مطالعہ رہتی ہیں یا منتخب مطالعہ کرتے ہیں؟

ج: نہیں بہت سی کتابیں چل رہی ہوتی ہیں ساتھ ساتھ۔ چونکہ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں

باقاعدہ وقت دے پاؤں تو مجھے جتنا وقت ملتا ہے تو کتاب کو میں تھوڑا تھوڑا سا پڑھ لیتا ہوں بیچ بیچ میں سے پڑھتا ہوں۔ بیشتر کتابیں ایسی ہیں کہ جنھیں مجھے پورا پڑھنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ میرے کام کی چیز یہ ہے وہ اسی وقت پڑھ لیتے ہیں۔

س: آپ کے خیال نثر کے میدان میں آج کل کس معیار کا ادب تخلیق ہو رہا ہے اور آپ کے پسندیدہ نام کون کون سے ہیں؟

ج: ایک تو یہ کہ غیر افسانوی نثر پر یہ کمال کا وقت ہے۔ رضا علی عابدی، پھر بالکل حال ہی میں داؤد رہبر، مختار مسعود اور شیخ مسعود الٰہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو نثر پر یہ بہت نفیس وقت ہے۔ اب ظاہر ہے کمی آئیگی۔ کیونکہ یہ بزرگ ہم میں سے اٹھ گئے ہیں اور آنے والوں میں، میں بہت ہی قدر سے دیکھتا ہوں ناصر عباس نیئر صاحب کا کام اور میں سمجھتا ہوں کہ اجمل کمال نے اس ملک کی بہت خدمت کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو آج کے عالمی ادب سے جوڑے رکھا ہے اور تیس برس کا چھوٹا عرصہ نہیں ہوتا۔ تیس پینتیس برس سے انھوں نے بالکل ذاتی Initiative پر، میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انھوں نے کن مشکلات سے گزر کر یہ کام کیا ہے وہ ایک Benefictor ہیں۔ وہ محسن ہیں ہماری قوم کے بھی اور ہمارے ادب کے بھی۔ آصف فرخی بہت اچھے ہیں۔ مجھے پسند ہے ان کا کام، ندیم روش مجھے ان کا کام بہت پسند ہے۔ مجھے ضیاء الحسن کے بہت سے نکات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان میں ایک نقاد کے طور پر ان کی جو سنجیدگی ہے اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ''یادوں کی بارات'' کا بہت شہرہ ہے، مجھے پسند نہیں ہے۔ دیکھئے اگر نثر پکڑی گئی تو پھر وہ کس کام کی۔



آٹھویں لاہور لٹریری فیسٹیول کے موقع پر پروفیسر ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا اور پروفیسر ڈاکٹر اصغر ندیم سید کے ہمراہ

باقاعدہ وقت دے پاؤں تو مجھے جتنا وقت ملتا ہے تو کتاب کو میں تھوڑا تھوڑا سا پڑھ لیتا ہوں بیچ بیچ میں سے پڑھتا ہوں۔ بیشتر کتابیں ایسی ہیں کہ جنھیں مجھے پورا پڑھنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ میرے کام کی چیز یہ ہے وہ اسی وقت پڑھ لیتے ہیں۔

س: اور شاعری کے میدان میں آپ کے پسندیدہ نام؟

ج: جی منیر نیازی اور اسحاق شناور مجھے بہت پسند ہے۔ عباس تابش کی شاعری کے کچھ حصے مجھے بہت Appeal کرتے ہیں۔ افضال احمد سید کو ہم نئی آواز تو نہیں کہہ سکتے نسبتاً وہ تو Classic میں آتے ہیں۔



منیر نیازی کے ہمراہ ایک یادگار تصویر

س: آپ کے خیال نثر کے میدان میں آج کل کس معیار کا ادب تخلیق ہو رہا ہے اور آپ کے پسندیدہ نام کون کون سے ہیں؟

ج: ایک تو یہ کہ غیر افسانوی نثر پر یہ کمال کا وقت ہے۔ رضا علی عابدی، پھر بالکل حال ہی میں داؤد رہبر، مختار مسعود اور شیخ مسعود الٰہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو نثر پر یہ بہت نفیس وقت ہے۔ اب ظاہر ہے کمی آئیگی۔ کیونکہ یہ بزرگ ہم میں سے اٹھ گئے ہیں اور آنے والوں میں، میں بہت ہی قدر سے دیکھتا ہوں ناصر عباس نیئر صاحب کا کام اور میں سمجھتا ہوں کہ اجمل کمال نے اس ملک کی بہت خدمت کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو آج کے عالمی ادب سے جوڑے رکھا ہے اور تیس برس کا چھوٹا عرصہ نہیں ہوتا۔ تیس پینتیس برس سے انھوں نے بالکل ذاتی Initiative پر، میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انھوں نے کن مشکلات سے گزر کر یہ کام کیا ہے وہ ایک Benefictor ہیں۔ وہ محسن ہیں ہماری قوم کے بھی اور ہمارے ادب

کے بھی۔ آصف فرخی بہت اچھے ہیں۔ مجھے پسند ہے ان کا کام، ندیم روش مجھے ان کا م بہت پسند ہے۔ مجھے ضیاءالحسن کے بہت سے نکات سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان میں ایک نقاد کے طور پر ان کی جو سنجیدگی ہے اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ''یادوں کی بارات'' کا بہت شہرہ ہے، مجھے پسند نہیں ہے۔ دیکھئے اگر نثر پکڑی گئی تو پھر وہ کس کام کی۔

س: انگریزی ادب میں آپ کی پسندیدہ کتاب؟

ج: ان گنت، لیکن مجھے جو زیادہ پسند ہیں ایک تو وہ Arther Miller کی ہے۔Time Bends اسے پڑھنے سے کبھی نہیں اکتا پایا۔

س: اردو زبان میں ایک اور کتاب کا بھی بہت شہرہ ہے جو خواتین کو عموماً جہیز میں بھی دی جاتی ہے؟

ج: وہ بھی ہاں وہ بہت Readable ہے اور وہ چیلنج نہیں کرتے اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ.....

س: اس میں تو وظیفے بھی بہت سے ہیں؟

ج: دیکھئے وظیفے کے عنوان ہی اس قدر پہلودار ہیں کہ میں وظیفے سے کچھ کتراتا ہوں۔

س: آج کی گفتگو کی کوئی آخری بات؟

ج: Celebrate Life۔ زندگی کا جشن مناؤ۔ زندگی میں خود بھی خوش رہو، دوسروں کو خوش رکھو۔

زاہدہ حنا

اردو کی نامور ادیبہ اور کالم نگار زاہدہ حنا نے فہمیدہ لالہ رُخ کے نام سے قیام پاکستان سے تقریباً نو ماہ قبل ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہندوستان کے صوبے بہار کے علاقے سہسرام میں معروف کتاب دوست شخصیت محمد ابوالخیر کے گھر جنم لیا جو قیام پاکستان کے بعد بذریعہ بحری جہاز ۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ کراچی چلے آئے۔ بچپن میں بیمار رہنے کے سبب کسی سیانے نے نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو زاہدہ بانو نام اختیار کیا گیا۔ تاہم اسکول کے رجسٹر میں ان کا اندراج زاہدہ ابوالخیر کے نام سے ہوا۔ لیکن ادبی دنیا انہیں زاہدہ حنا کے نام سے جانتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل زاہدہ آپا سے ایک نشست ہوئی اس دوران ان سے کیا مکالمہ ہوا؟ آپ بھی پڑھیے:





س: آپ اپنے ادبی سفر کے دوران لاتعداد ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں، کچھ یاد ہے کہ پہلا ایوارڈ کب حاصل کیا تھا؟

ج: دراصل آٹھویں جماعت میں، میں نے ایک تحریری مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اس میں مجھے حوصلہ افزائی کا ایوارڈ ملا تھا اور میں دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ پہلے نمبر پر کوئی اور تھا اور اس کے بعد سے اب تک ایوارڈز تو بہت سے ملے لیکن جو ایک دو قابل ذکر ہیں میرا خیال ہے کہ ان کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ ایک تو مجھے ۲۰۰۱ء میں ہندوستان کے صدر نے سارک لٹریچر ایوارڈ دیا اور یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ مجھے پہلا اعزاز ۲۰۰۱ء میں ملا تھا اور ۱۹۶۱ء میں مجھے وہ Citation ملا تھا جس کا ابھی آپ سے ابتدا میں ذکر کیا ہے تو یہ ۴۰ سال کا سفر تھا۔ اس کے بعد پھر مجھے ۲۰۰۶ء میں حکومتِ پاکستان نے صدارتی ایوارڈ جسے پرائڈ آف پرفارمنس بھی کہتے ہیں دیا لیکن میں نے وہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ جب ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو پرویز مشرف نے منتخب حکومت کا تختہ اُلٹا تھا تو اس کے بعد میرا کالم ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو چھپا تھا تو اس وقت سے میں ان کے خلاف لکھ رہی تھی۔ ان کے نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں آمریت کے خلاف لکھ رہی تھی اور جمہوریت کے حق میں لکھ رہی تھی تو میں نے پھر ایک خط لکھا جو کالم کے طور پر بھی چھپا۔ میں نے کہا کہ جس حکومت کے خلاف اور جس نقطہ نظر کے خلاف میں اتنے عرصے سے لکھ رہی ہوں تو میں اس حکومت کے سربراہ اور ایک آمر سے میں کوئی ایوارڈ نہیں لے سکتی اور میں نے واپس کر دیا تھا۔ پھر ۲۰۱۱ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے یہ ایوارڈ مجھے پھر سے دیا اور مجھے ایوارڈ سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ جو اس کا Citation تھا اس پر یہ لکھا گیا تھا کہ یہ ایوارڈ ان کو ۲۰۰۶ء میں فوجی آمر نے دیا تھا لیکن انہوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

اب ہم انہیں دوبارہ سے دے رہے ہیں۔ وہ میں نے پھر قبول کیا تھا۔

س: آپ براڈ کاسٹر بھی ہیں اور دنیا کے تین بڑے نشریاتی اداروں ریڈیو پاکستان، بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے بھی منسلک رہیں تو یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج: دیکھئے اگر میں یہ کہوں کہ ابھی بھی میں براڈ کاسٹر ہوں تو یہ غلط بات ہوگی میں نے ریڈیو پاکستان کی عالمی سروس کے لئے سات برس ہفتہ وار ایک پروگرام کیا تھا جو خطوط سے متعلق تھا جس میں خطوط کے جوابات ہوتے تھے اس میں میرا خیال ہے کوئی ایسی بات ہوگی جو لوگوں کو پسند آئی اور پھر وہ سلسلہ چلتا رہا اور سات برس کے بعد پھر میں نے اسے چھوڑا اور وہ بھی اس لئے چھوڑا تھا کہ میں انگلینڈ جا رہی تھی چونکہ BBC میں میرا تقرر ہو گیا تھا بطور اسسٹنٹ پروڈیوسر اور میں وہاں ساڑھے چار سال کے لئے گئی تھی BBC۔ لیکن میرا اتنا جی گھبرایا وہاں کہ میں ڈیڑھ سال کے بعد استعفیٰ دے کر واپس آ گئی اور جہاں تک ''وائس آف امریکہ'' کا تعلق ہے، یہاں پاکستان میں وائس آف امریکہ کا ایک دفتر کراچی میں تھا اور وہاں سے ڈرامہ انٹرویو اور دیگر تمام پروگرام بذریعہ Tapes جاتے تھے واشنگٹن پھر وہاں سے وہ نشر ہوتے تھے اور صرف وائس آف امریکہ، خبریں وہاں سے نشر کرتا تھا وہاں میں نے کوئی ڈھائی سال کام کیا اور اسکے چھوڑنے کا لطیفہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ویت نام جنگ عروج پر تھی ظاہر ہے ۶۹-۱۹۶۸ء کا زمانہ تھا اور امریکیوں کے جو مظالم تھے وہ بھی عروج پر تھے تو جو مظاہرے وغیرہ ہوتے تھے یا بیانات دیئے جاتے تھے میں اس میں شریک ہوتی تھی اس بیان پر دستخط ہوتے تھے میرے۔ اپنے ہی دوست میں سے کسی نے وہ تراشے ہمارے Information Officer کے پاس پہنچا دیے Mr.John Constable ان کا نام تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ بھئی یہ تمھاری تصویریں ہیں کیا؟ میں نے کہا کہ جی بالکل۔ تم نے یہ دستخط کئے ہیں؟ میں نے کہا جی بالکل۔ انہوں نے کہا بھئی یہ عجیب بات ہے کہ وائس آف امریکہ کے لئے تم کام کرتی ہو اور وہاں امریکہ کے خلاف مظاہروں میں شریک بھی ہوتی ہو؟ میں نے کہ بھئی اس لئے شریک ہوتی ہوں کہ آپ لوگ غلط ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہم غلط ہیں تو پھر تمھیں ہمارے لئے کام نہیں کرنا چاہئے اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اپنے اس رویئے کو ترک کر سکتی ہو تو بصد شوق کام کرتی رہو۔ میں نے کہا آپ نے بات بالکل بجا کہی ہے تو میں اب کام نہیں کر سکتی چونکہ آپ کی یہ اصولی بات درست ہے سو وہ میں نے چھوڑ دیا تھا۔



س: آپ نے ٹی وی کے لئے بھی بہت عمدہ ڈرامے تحریر کئے، اس سلسلے کا آغاز کیسے ہوا؟

ج: میں آپ سے عرض کروں کہ مجھے ٹی وی کے لئے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہارون رند مرحوم بہت اچھے زبردست پروڈیوسر تھے پی ٹی وی کے۔ وہ میرے پیچھے کوئی ڈھائی برس لگے رہے۔ ادی لکھو، ادی دور تک

بات جاتی ہے۔ادی اخبار کے کالم سے کیا ہوتا ہے۔خیر انہوں نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں لکھوں گی لیکن اس میں کوئی پیغام ہوگا۔کہنے لگے کہ ہاں ہاں بالکل میرا وعدہ۔پھر میں نے پہلا جوٹی وی کے لئے طویل دورانیے کا کھیل لکھا۔''زرد پتوں کا بن'' وہ ہارون رند مرحوم کے لئے لکھا تھا۔اور وہ بہت اچھا تجربہ رہا اور ہارون رند مرحوم نے بھی بہت ہی ایمانداری سے اس میں کسی قسم کی کتر بیونت نہیں کی اور وہ چلا اور بہت پسند کیا گیا۔اب میں چونکہ چیزوں کا ریکارڈ نہیں رکھتی اس لئے حتمی طور پر مجھے یہ نہیں معلوم کہ پتا نہیں جرمنی سے یا کسی اور ملک سے اس ڈرامے کو بھی کوئی ایوارڈ بھی ملا تھا۔اس کے بعد میں نے ساحرہ کاظمی کے لئے لکھا اور اس میں قینچی چلی تھی میرے ایک ڈائیلاگ کے اوپر۔

س: آج کل ہمارے ٹی وی چینلز اور سینما گھروں میں ہندوستانی اور دیگر غیر ملکی ڈراموں اور فلموں کی یلغار ہے اس رجحان کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج: دیکھئے میں نے بڑا شور مچایا تھا کہ ہندوستانی فلمیں جو دکھائی جاتی ہیں تو اُن کو فوراً بند ہو جانا چاہیے۔چونکہ ہماری فلم انڈسٹری کو نقصان پہنچ رہا ہے۔یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ہمارے یہاں ''وعدہ''، ''یکے والی'' اور ''حمیدہ'' اور اس قسم کی بے پناہ اور بہت عمدہ فلمیں بن رہی تھیں۔اس وقت ہندوستانی فلمیں بند ہو گئی تھیں۔پاکستان میں فلم نگری کے لوگوں نے جال موومنٹ چلائی تھی اور اس کے نتیجے میں ہندوستانی فلمیں بند ہو گئیں اور اس کے بعد ہماری فلم انڈسٹری جس طرح سر کے بل گری ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔اب آج یہ عالم ہے کہ ہم اگر چاہیں بھی کہ اپنے سینما گھروں میں پاکستانی فلمیں دکھائیں تو فلمیں نہیں ملتیں دکھانے کو۔اچھا اب اسی طرح شور مچ رہا ہے۔ترکی ڈراموں کے بارے میں۔ہندوستان کے بارے میں تو یہ کہا جاتا تھا کہ بھئی یہ تو کافرانہ ریاست ہے اس کی بنائی ہوئی فلمیں ہیں۔اور اس میں ہندوازم کا پرچار ہو رہا ہے اور بدعت ہے وغیرہ وغیرہ جو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے۔اب جو ترکی کے ڈرامے آتے ہیں ان پر بھی ہمیں اعتراض ہے۔دراصل مشکل یہ ہے کہ ہم محنت کرنے کو راضی نہیں ہیں۔ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم محنت کریں اور اچھے ڈرامے بنائیں چونکہ اچھے ڈرامے تو دیکھے جاتے ہیں اور ترکی کے ڈرامے بھی جو دیکھے جا رہے ہیں وہ اس لئے دیکھے جا رہے ہیں کہ ان کے اندر ایک نیا ذائقہ ہے، نئے چہرے ہیں، نیا ماحول اور منظر نامہ ہے۔ہم ہر چیز کو اپنی دشمنی پر محمول کر لیتے ہیں۔میرا یہ خیال ہے کہ وہ نہیں ہمیں کرنا چاہیے۔دوسری بات یہ کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ترکی کے ڈرامے ہمارے معاشرے کے لئے مخرب الاخلاق ثابت ہو رہے ہیں ہمیں یہ سوچنا چاہئے بلکہ میں تو یہ سوال کرتی ہوں کہ بھئی اگر آپ ترکی کو ایک مسلمان ملک مانتے ہیں اور آپ ترک دوستی کے قصیدے گاتے ہیں تو اتنا آپ کو کیا اعتراض ہے؟ کیا اس لئے کہ وہاں شراب پیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہاں جو اور دیگر معاملات دکھائی دیتے ہیں اور مجھے جو سب سے زیادہ Fascinate کرتا ہے، ترکی کا ڈرامہ ''میرا



سلطان'' ہے اور اسے میں نے شروع سے دیکھا ہی نہیں کوئی اس کی ڈیڑھ سو قسطیں پونے دو سو قسطیں نکل گئیں اچانک جب ایک دن میری نظر پڑی اس پر تو میں بیٹھ گئی اور پھر میں دیکھتی ہی چلی گئی اور میں اب تک دیکھ رہی ہوں اس سے دو کام ہوئے۔ ایک تو میری ذاتی ایسوسی ایشن یہ تھی کہ جب میں نویں میں تھی تو ہمارے اسکول کی طرف سے سالانہ تقریب بڑی زبردست ہوتی تھی، ڈرامے بھی ہوتے تھے اس میں ایک ڈرامہ ہوا ''کوسم سلطان'' کے نام سے وہ ایک ٹرکش کردار ہے، خاتون کا جیسے آپ اس میں دیکھ رہے ہیں''



حورم سلطان'' کا ہے تو اس میں وہی بادشاہوں اور وزیر کی لڑائی وغیرہ وغیرہ۔ یہی محلاتی سازشیں جن کا رونا پیٹنا ہم ہر وقت مچاتے رہتے ہیں تو جناب اس میں، میں وزیر بنی تھی اور پھر یہ ہوا کہ بادشاہ کے حکم سے مجھے قتل کیا گیا اور میرا سر لایا گیا۔ اب وہ میرے خون سے لتھڑا ہوا ظاہر ہے لپ اسٹک وغیرہ پتہ نہیں جو کچھ بھی لگایا گیا ہوگا۔ ہماری ٹیچر نے تھوڑا اصل رکھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے لوگ بہت ہی پریشان ہوئے اور بہت تالیاں بھی بجیں تو اس وقت کا میرا وہ Fascination تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ''میرا سلطان'' میں مجھے خلافتِ عثمانیہ کی اور مغل سلطنت کی پوری تاریخ نظر آتی ہے اور ہم اگر اسے سنجیدگی سے دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہماری تنزلی ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ آپ مثال کے طور پر یہ دیکھیں کہ اگر آپ پیٹرِ اعظم کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ بھئی ہمارے پاس بحری جہاز ہونا چاہیے کیونکہ بحری قوت بنے بغیر ہم حکومت نہیں کر سکتے تو پیٹرِ اعظم تخت سنبھالنے کے بعد جرمنی چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر خود وہ جہاز بنانے کی تربیت لیتا ہے اور اس کے بعد روس ایک عظیم بحری طاقت بن کر اُبھرتا ہے۔ یہاں جب ہم سلطان کو دیکھتے ہیں تو اس میں یا تو وہ بیٹھے ہوئے نقاشی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے جو ہونے والے سلطان ہیں سرود اور بربط بجا رہے ہیں یا پھر وہ اپنی محبوباؤں کے لئے جڑاؤ انگوٹھیاں بنا رہے ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں کو تفریحی طور پر نہ دیکھیں بلکہ اس کو بھی ایک سبق حاصل کرنے کے طور پر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے زوال اور ان کے زوال کے کیا اسباب ہیں۔ دراصل میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں چونکہ ان کے اب بعض ڈرامے میں نے نہیں دیکھے ہیں لیکن تعریفیں بہت سنی ہیں جیسے ''عشقِ ممنوع'' کی اور ''عفت''

کی، ان کے علاوہ کئی اور ڈرامے ہیں لیکن یہ تو ہمیں سیکھنا چاہیے اور بطور خاص اگر آپ کو تاریخ سے کوئی دلچسپی ہے تو ''میرا سلطان'' دیکھنا بہت ضروری ہے تاریخی پس منظر میں۔

س: آپ ہندوستان کے اخبارات کے لئے بھی لکھتی ہیں؟ روزنامہ ایکسپریس میں بھی باقاعدگی سے کالم لکھتی ہیں، سندھی اخبارات میں بھی لکھتی ہیں تو ان سب کے لئے مواد کہاں سے اکٹھا کرتی ہیں، اور کبھی کبھار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو دیگر کالم نگاروں کی نسبت زیادہ آزادی ہے؟

ج: دیکھئے ہندوستان کے لئے جو میں لکھتی ہوں ''بھاسکر'' کے لئے۔ ''پاکستان ڈائری'' اس کا نام ہے تو جو واقعات پاکستان میں ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں میں لکھتی ہوں کہ بھئی کیا ہو رہا ہے کیا نہیں ہو رہا ہے۔ سندھی اخبار ''عبرت'' کا جو میرا کالم ہوتا ہے وہ عموماً بہت سیاسی ہوتا ہے اور وہ بہت سخت ہوتا ہے اس کا لہجہ سخت ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھی اخبار اپنے لکھنے والوں کو جتنی گنجائش دیتے ہیں وہ اردو اخبار نہیں دیتے عمومی طور پر اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے اخبارات تھڑے پر پڑھے جاتے ہیں۔ عوامی ہیں اور جو بطور خاص پنجاب میں پڑھے جاتے ہیں کراچی میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان کا جو پڑھنے والا ہے اس کو اتنا جسے کہنا چاہیے کہ Indoctrine کر دیا گیا کہ وہ بہت سی چیزوں کو برداشت نہیں کرتا۔ اچھا میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ اردو میں بھی میں بہت آزادی لے لیتی ہوں، بہت آزادی سے لکھتی ہوں اور بطور خاص میں بہت داد دوں گی ''ایکسپریس'' کی انتظامیہ کو کہ آج کی تاریخ تک تیرہ سال ہو گئے ہیں ان کے لئے لکھتے ہوئے اور ہفتے میں ان کے لئے میں دو کالم لکھتی ہوں انہوں نے کبھی بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ یہ لکھیے اور یہ نا لکھیے یا یہ جملہ بہت سخت ہے اسے نکال دیجئے۔ آزادی مجھے دی ہوئی ہے انہوں نے اور شائد اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں آزادی لیتی بہت ہوں تو وہ مجھے آزادی دیتے بہت ہیں۔

س: کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ آپ کی تحریروں میں اردو ادب کی ایک اور سرکردہ ادیبہ قرۃ العین حیدر کا انداز جھلکتا ہے۔ تو کیا ایسا شعوری طور پہ ہے یا لاشعوری طور پہ؟

ج: نہیں دیکھئے یہ یقینی طور پر شعوری نہیں ہے لیکن لاشعوری یقیناً ہوگا اور جو لوگ کہتے ہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ تو سچائی ہوگی اور اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ جو انداز نظر آتا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو تاریخ سے میری گہری دلچسپی اور دوسرا یہ ہے کہ ہندوستان میں جو ایک تہذیب تھی جسے گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا تھا اس سے میری بہت وابستگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے چونکہ اثرات آتے ہیں تو وہ عینی آپا کے ہاں ہی ملتے ہیں وہ امام ہیں اس طریقہ تخلیق کی، اس لئے شائد یہ کہا جاتا ہے اور میں اس کو بالکل برا نہیں جانتی۔

س: آپ کی تخلیقات کے کن کن زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور آپ کے خیال میں کس زبان میں آپ کی تخلیقات کے ترجمے نے حق ادا کیا ہے؟

ج: دیکھیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ کس زبان نے ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ سب سے زیادہ سندھی ہے اور پھر



بمبئی میں ساحر لدھیانوی کی نئی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے عقب میں ساحر کی ماموں زاد بہن انور سلطانہ

ہندی میں اور انگریزی میں یعنی میں اُسی ترتیب سے بیان کر رہی ہوں ۔ جرمن زبان میں بھی ہوا ہے اور بنگلہ میں بھی ہوا ہے نیپالی میں ہوا ہے تو ظاہر ہے میں نہیں کہہ سکتی کہ کس زبان میں حق ادا ہوا ہے لیکن سب سے زیادہ میرے جو افسانے ترجمہ ہوئے ہیں وہ سندھی میں ہوئے ہیں، ہندی میں ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ انگریزی میں ہوئے ہیں اور پھر کئی اور زبانوں میں ہوئے ہیں۔

س: ایک زمانہ تھا کہ خواتین کے مطالعے کے لئے بھی خصوصی جریدے جیسے ''اخبار خواتین''، ''حور''، ''سکھی گھر'' اور ''بتول'' سمیت دیگر جرائد شائع ہوتے تھے اسی طرح ادب کے فروغ میں ''سب رنگ'' ڈائجسٹ کا بڑا اہم کردار تھا آپ خود بھی ''اخبار خواتین'' سے وابستہ رہیں لیکن آج کل ہمیں خواتین کے لئے کوئی خصوصی علیحدہ اعلیٰ معیار کا جریدہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ''سب رنگ'' کی بندش کے بعد اُس معیار کا ادبی جریدہ بھی آج تک شائع نہیں ہوسکا، اسکی کیا وجوہات ہیں؟

ج: دیکھئے ایسا ہے کہ جب ''اخبار خواتین'' نکلا تھا تو حیران کن حد تک اس نے چھلانگ لگائی تھی اور وہ ۵۶ ہزار فی ہفتہ چھپتا تھا جو اُس وقت ایک نا قابل یقین اشاعت تھی اس نے بہت کامیابیاں حاصل کیں اور میں بہت خوش نصیب ہوں کہ اس کے کامیاب ترین زمانے میں، میں اس سے وابستہ رہی۔ اس کے بعد روزنامہ ''مشرق'' کے لئے میں نے کالم لکھے۔ اس زمانے میں ۲۰ برس کی عمر میں روزانہ کالم لکھنا وہ بھی آدھا صفحہ اخبار کا وہ بہت مشکل کام تھا لیکن خیر وہ میں نے کیا اور جہاں تک آپ خواتین کا پوچھ رہے ہیں تو اب جو خواتین کے ڈائجسٹ نکلتے ہیں ایک عرصے سے، وہ خواتین کے لئے ہیں اور اس میں کہانیاں چھپتی ہیں ان کی پسند کی چیزیں ہوتی ہیں بلکہ بہت سی تو خواتین کی جو پسندیدہ لکھنے والیاں ہیں وہ اب ٹیلی ویژن کے لئے لکھ رہی ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔ خواتین کا تو یہ ایک مسئلہ ہے۔ جہاں تک ڈائجسٹوں کا سوال ہے تو ڈائجسٹ ایک زمانے میں عروج پر تھے اور انہوں نے بہترین ادب ڈائجسٹ کیا۔ جب میں ''عالمی ڈائجسٹ'' کو ایڈٹ کر رہی تھی تو میں نے الگ سے خصوصی طور پر نگارشات لکھوائیں بلکہ میں نے جو بہترین ہمارے ادیب تھے ان کی تحریریں اس میں شامل بھی کیں لیکن اب وہ ماحول نہیں رہا۔



س: آپ کی اولاد میں سے بھی کسی کو فنون لطیفہ کی مختلف اصناف سے شغف ہے؟

ج: بالکل دراصل میری تو خیر بہت خواہش تھی کہ یہ لوگ لکھیں اور بڑی بیٹی میری جو ہے فینا نہ فیر نام۔ اس نے کچھ چیزیں لکھی بھی TV پر بھی کام کیا اور پی ٹی وی کے ٹاک شوز کی میزبانی بھی کی لیکن وہ سنجیدہ نوعیت کے موضوعات ہوتے تھے۔ چھوٹی بیٹی جو ہے سحینا اس نے بھی PTV کے لئے سنجیدہ پروگرام کی میزبانی کی لیکن اس کا رجحان فائن آرٹس کی طرف ہے اور اس نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم فل کیا ہے۔ اور بیٹا زریون جو ہے اس کو بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ اسکی مادری زبان انگریزی ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی مادری زبان میں ہی لکھ لو لیکن اسے لکھنے سے دلچسپی نہیں ہے ہاں البتہ اسے سائنسی موضوعات سے دلچسپی خاص طور پر ماحول

کے معاملات سے ہے لیکن یہ دونوں جو میری بیٹیاں ہیں ان کو لکھنے سے دلچسپی ہے اور سحر سینا کو تو خیر بہت ہے چونکہ وہ آرٹس سے وابستہ ہے۔

س: ذرا ماضی میں جھانکتے ہیں یہ فرمایئے کہ نصف صدی قبل آپ نے بچپن میں اپنے آس پاس کیسا علمی و ادبی ماحول پایا؟

ج: دیکھیں جہاں تک علمی اور ادبی ماحول کا تعلق ہے وہ تو ہمارے گھر کا بہت مضبوط تھا اور ماضی سے مضبوط چلا آ رہا تھا تو اس میں ہمارے اوپر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جیسے لوگوں کے بارے میں سنتی ہوں پڑھتی ہوں کہ بھئی انہیں پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے یہاں الماریاں بھری ہوتیں تھی کتابوں سے اور ہمیں کوئی قدغن نہیں تھی کہ کیا پڑھیں ہم اور کیا نہ پڑھیں، صرف ایک کتاب منع تھی اور وہ تھی ''بہشتی زیور'' کہ یہ نہیں پڑھنی تو وہ تالے میں رکھی جاتی تھی لیکن ہم نے خیر وہ بھی پڑھ لی۔

س: ''بہشتی زیور'' کے کچھ ابواب کے آغاز میں تحریر ہے کہ یہ ابواب بچوں کو نہ پڑھنے دیئے جائیں تاوقتیکہ وہ جوان نا ہو جائیں تو آپ نے وہ ابواب اپنے بچپن میں پڑھے یا جوانی میں پڑھے؟

ج: (ہنستے ہوئے) نہیں نہیں وہ میں نے تو چونکہ نو برس کی عمر میں پڑھ لی تھی۔ یہ ہے کہ کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں تھی۔ والد کا فارسی اور اردو کے بہت اچھا ذوقِ مطالعہ تھا اور ان کے پاس کتابوں کا بہت وسیع ذخیرہ تھا اور والدہ میری جو تھیں ان کے پاس کہانیوں کے بہت سے مجموعے تھا ''طلسم ہوش رُبا'' کی تو ہمارے گھر میں مکمل ۴۸ رجلدیں موجود تھیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، ''داستانِ امیر حمزہ''، اس کے علاوہ ''الف لیلیٰ''، پھر مرزا عظیم بیگ چغتائی کا پورا سیٹ اور اس کے بعد کے تو سارے ہی لکھنے والے مصنفین کی کتب موجود تھیں۔



س: آپ کو بچپن سے ہی اعلیٰ علمی و ادبی ماحول ملا جب آپ نے خود لکھنا شروع کیا تو آپ کا رول ماڈل کون بنا؟

ج: میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ کوئی میں نے معیار بنایا تھا لیکن معیار تو ہوتا ہے نا۔ وہ تو ہمیں معلوم ہے کہ کلاسکس کیا ہوتے ہیں؟ عظیم ادب کیا ہوتا ہے؟ بڑے لکھنے والے کون ہوتے ہیں۔ میری خواہش ہمیشہ رہی آج بھی ہے کیونکہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں نے وہ کام نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا جتنا کرنا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود آج بھی میں جیسے نئے لفظوں کی تلاش میں رہتی ہوں یا لفظوں کے شیڈز ہیں ان کی تلاش میں رہتی ہوں۔ ہمارے گھر یعنی والد کے گھر میں بھی متعدد لغتیں تھیں لیکن بھئی میں نے تو بطورِ خاص لغتیں جمع کیں اور آج بھی لغت خریدتی ہوں تو یہ سارے وہ معاملات ہیں جو آپ کو لکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اب میں برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ ۳۵ برس سے کہ لوگ لکھتے ہیں اور اس کی املاء بھی درست نہیں کرتے اور اسے لے کر یا تو کسی رسالے کے دفتر پہنچ جاتے ہیں یا اسے حوالۂ ڈاک کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بڑا کام کیا۔ کام ایسے نہیں ہوتا کام کے لئے تو بہت آنکھوں کا تیل جلانا پڑتا ہے۔

س: آج کل آپ کی ادبی مصروفیات کیا ہیں؟

ج: اب میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنا سامان سمیٹوں تو میں اپنی کچھ چیزیں اکٹھا کر رہی ہوں مضامین اور کچھ افسانے، ایک دو ناول اور ایک چیز جو میں آغاز کرنے والی ہوں وہ ہے خودنوشت، اور وہ خود نوشت عام طور پر تو لوگ اس طور لکھتے ہیں نا کہ بھئی ہم نے کتنے بڑے ادیبوں سے ملاقات کی اور کتنے بڑے ادیبوں کے ساتھ وقت گذارا، میں اپنی جو ساری یادیں ہیں جو کہ حقیقت ہے کہ میری زندگی کتابوں کے ساتھ گذری۔ یعنی اگر مجھ سے کوئی کہے کہ بھئی آپ نے عشق کیا؟ جی صاحب کیا۔ آج تک کر رہے ہیں اور عشق بدلتا رہتا ہے۔ میں تو کتابوں سے عشق کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ کبھی ''اورحان پاموک'' سے کرتی ہوں کبھی ''قرۃ العین حیدر'' سے کرتی ہوں۔ کبھی ''ٹالسٹائی'' سے کرتی ہوں تو یہ ہے صورتحال۔ کتابوں سے زیادہ میرے لئے کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔

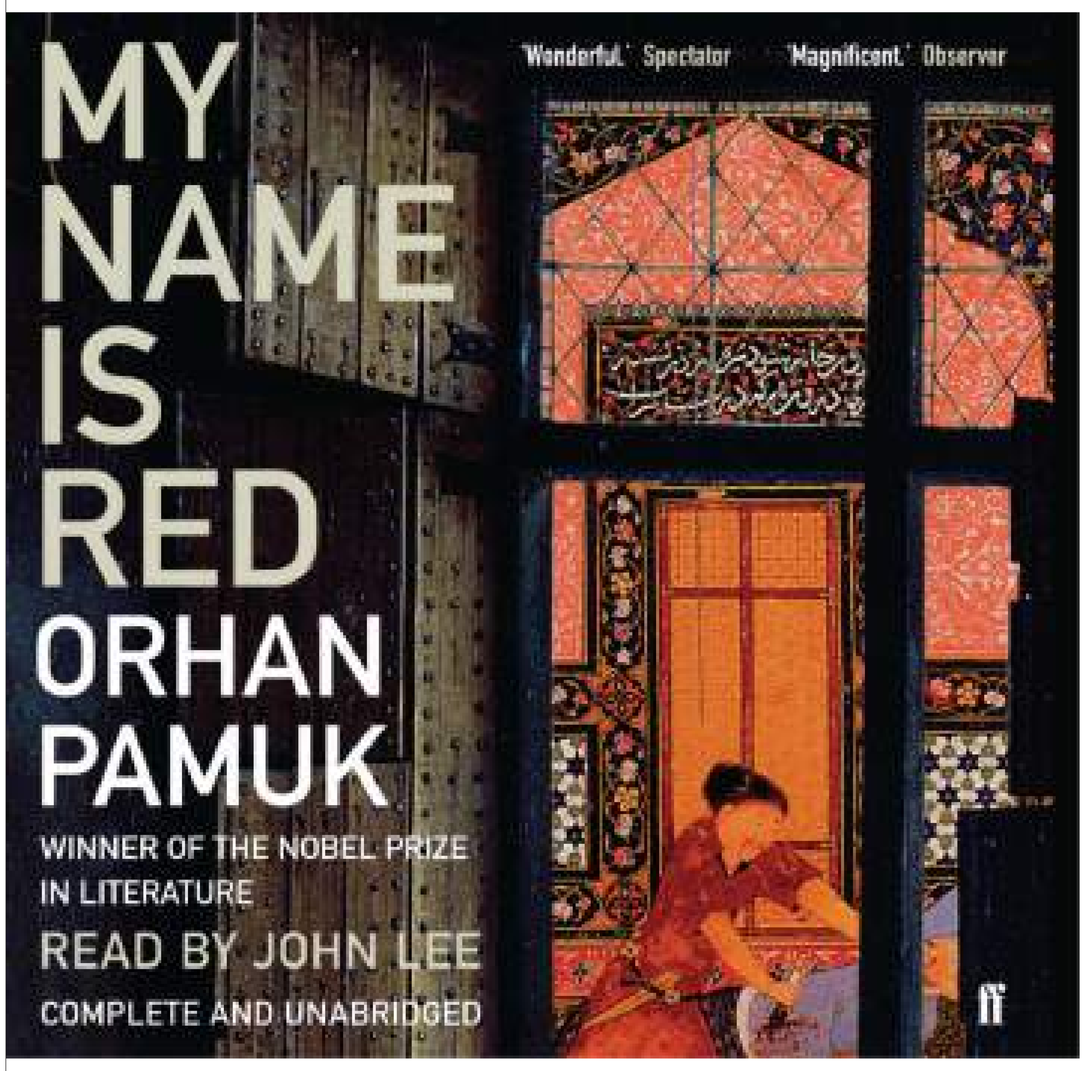


زاہدہ حنا، عصمت چغتائی اور رئیس امروہوی (۱۸ ستمبر ۱۹۷۸ء)

س: تو گویا کتاب آپ کی بہترین ساتھی ہے؟

ج: نہیں کتاب میری بہترین ساتھی نہیں کتاب میری بہترین محبوب ہے۔ دیکھئے میں آپ سے عرض کروں آپ یہ صحیح کہہ رہے ہیں کہ کسی کتاب کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے بیشتر جو میری پسندیدہ کتابیں ہیں وہ تاریخ سے متعلق ہیں یا اب جیسے میں نے ''اورحان پاموک'' کی کچھ کتابیں پڑھیں، 'My Name is Red'' اور Snow اور دیگر چیزیں 'My Name is Red'' کمال کتاب ہے۔ کمال ناول ہے اس کا ۔قرۃ العین حیدر کی چیزیں میں نے بار بار پڑھیں ہیں، اسی طرح عظیم بیگ چغتائی جن کا ہمارے ہاں کوئی ذکر نہیں کرتا ان کو بہت ہی محبت سے پڑھا ہے۔ ان کی ایک کہانی تھی ''مہارانی کا خواب''۔ اچھا آج شائد

میرا یہ خیال ہے کہ اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا لیکن کیا قیامت کی کہانی انہوں نے راجستھان کے پس منظر میں لکھی ہے اسی طرح ''سوانا کی روحیں'' ہے۔اچھا اس کے بعد اگر آپ مغربی ادیبوں پر آئیں تو ٹالسٹائی ہے چیخوف ہے اور اسی طرح فرانسیسی ادیب ہیں اطالوی ہیں تو جب آپ کتابیں پڑھتے ہیں نا تو اس میں یہ نہیں ہوتا کہ کوئی ایک کتاب ہوتی ہے یا ایک شاہکار ہوتا ہے دوسروں کے لئے ہوتا ہوگا میرے لئے نہیں ہے۔



س: کچھ ایسی یادیں جن کو آج بھی بھول نہ پاتی ہوں؟

ج: نہیں یادیں دل سے تو نہیں نکلتیں آپ کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں یاد کیسے نکالیں گے آپ؟۔اس لئے کہ وہ آپ کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔یعنی مثال کے طور پر تین برس کی جو چیزیں مجھے یاد ہیں میں انہیں کیسے نکال سکتی ہوں۔یا تیس برس کی عمر کی چیزیں۔یاد نہیں نکلتی۔یاد آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔اس کا رنگ چوکھا ہوسکتا ہے اس کا رنگ ہلکا ہوسکتا ہے۔

س: چاہے یادیں خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار؟

ج: دیکھیں ناخوشگوار یادیں بھی میری ہی ہیں۔خوشگوار یادیں بھی میری ہی ہیں اور دونوں مجھے عزیز ہیں۔

س: موسیقی سے کتنی دلچسپی ہے آپ کو؟

ج: بے حد اس لئے کہ میرے والد نے اسکی تربیت کی تھی۔ ہمارے گھر میں اس زمانے میں گراموفون تھا اور میرا کام یہ تھا کہ اس کو بہت نرم کپڑا ہوتا تھا پیلے رنگ کا اب بھی ہوتا ہے، اس سے پالش کر کے رکھوں اور سوئی بدلوں اور اس میں چابی بھر دوں تا کہ ابا بھی سُنیں اور ان کے صدقے میں بھی سن لوں۔

س: اُس دور کی معروف اور نایاب آوازیں جو آج بھی آپ کے کانوں میں رس گھولتی ہوں؟

ج: دیکھئے اسی زمانے میں تو ''کملا جھریا'' کو سنتے تھے۔ ''ملکہ پکھراج'' سنتے تھے اور دیگر چیزیں سنتے تھے یہ میں آپ سے بات کر رہی ہوں ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء کی۔ اس کے بعد بھی سنتی رہی ہوں۔ غزلیں بھی سنیں مجھے تو وہ



خبرِ تحیرِ عشق سن
نہ جنوں رہا نہ پری رہی

سراج اورنگ آبادی

سلیم چشتی بھی جو ریڈیو پاکستان سے مثنوی پڑھتے تھے ترنم کے ساتھ مجھے وہ بھی بہت پسند ہیں۔ پھر بہزاد لکھنوی صاحب کی ہے

''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے''

یہ ہے اور بے مثال غزلیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ یہ سمجھیں کہ وہ

چلی سمتِ غیب سے اِک ہوا
کہ چمن طیور کا جل گیا

سراج اورنگ آبادی کی ڈھائی سو برس پرانی غزل ہے:

"نہ جنوں رہا نہ پری رہی"

یہ ہے اور بے شمار غزلیں ہیں اور غالب ہے۔

س: سنا ہے کہ آپ کو کھانا پکانے میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے اور خاص طور پر بہت لذیذ دال بناتی ہیں؟ اسی طرح کیا یہ بات درست ہے کہ اگر آپ کسی الجھن کا شکار ہوں یا اداس ہوں تو برتن دھونا شروع کر دیتی ہیں؟

ج: بالکل صحیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کھانا پکانا بھی ایک بڑا محبت کا عمل ہے کھانا آپ ان کے لئے پکاتے ہیں کہ ایک تو یہ ہوتا ہے نا کہ ہانڈی جھونکنا ایک ہوتا ہے کھانا پکانا دونوں میں بنیادی فرق ہے کہ کھانا میں اپنے بچوں کے لئے پکاتی ہوں یا اپنے دوستوں کے لئے پکاتی ہوں تو اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے اور اس عمل سے اگر میں اداس ہوں تو اس اداسی میں کمی ہوتی ہے اگر میں کسی الجھن میں ہوں تو اس الجھن سے نکلنے میں مجھے مدد ملتی ہے اور برتن دھونا جو ہے وہ ایک بالکل تکنیکی عمل ہے اس میں آپ کو کچھ اور نہیں کرنا پڑتا صرف پانی، صابن اور برتن کا رشتہ ہوتا ہے، آپ دھوتے چلے جائیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اداسی جو ہے نا پھر اسی صابن اور پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔

س: آپ کے ہاتھوں پکی لذیذ دال کا راز کیا ہے؟

ج: نہیں! اس کا کوئی راز نہیں ہے بس اسے محبت سے چڑھا دیں۔

س: یعنی گھر کی مرغی دال برابر؟ آخر وہ دال ہے کون سی؟

ج: کچھ لوگ اسے پنچ میل دال کہتے ہیں کچھ اسے کیوٹی کہتے ہیں۔ مجھے بہت پسند ہے میں بہت شوق سے پکاتی ہوں۔ میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں کہ ایک مرتبہ اسلام آباد میں جب نیشنل بک فاؤنڈیشن کی اختتامی تقریب میں تجاویز لی جا رہی تھیں اگلے برس کے لئے تو میں نے کہا کہ حضور دو کام کیجئے کہ ایک تو یہ کہ آپ سب کو کھڑا کر کے جو حلف لیتے ہیں، اس کو پھاڑ کر پھینک دیجئے اس لئے کہ جنہیں کتاب سے محبت ہوتی ہے انہیں کسی حلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم نے چار برس کی عمر سے کتاب سے عشق کیا تو اس وقت کسی نے مجھ سے حلف نہیں لیا تھا اور مجھے جو اِکنّی ملتی تھی اس کو بھی جمع کرتی تھی میں کہ کتابیں خرید سکوں اور دوسرا میں نے یہ کہا کہ خدا کے واسطے دال بھی پکا کر رکھ دیا کیجئے یہ مرغیاں کھا کھا کے ہم تنگ آ گئے ہیں۔

س: زاہدہ آپا کوئی آخری بات جو آپ کہنا چاہتی ہوں؟

ج: میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ دیکھئے اس وقت ہمیں جن معاشرتی مسائل کا سامنا ہے انکو ہم صرف تعمیری سوچ، مثبت خیالات اور بہترین کتابوں کے مطالعہ کے زریعہ حل کر سکتے ہیں۔



کملا جھریا

ضیاء محی الدین

یہ بیسویں صدی کی اس دہائی کا واقعہ ہے جب دنیا کے ہر کونے میں جنگ وجدل کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اگر ایک طرف آدھی دنیا پر برطانوی راج چھایا ہوا تھا تو دوسری طرف برصغیر میں بھی مسلمانوں میں کچھ کچھ سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناب ولایت سے برصغیر واپس آ کر ایک نوجوان بیرسٹر کے طور پر اپنا لوہا منوا رہے تھے کہ اس زمانے میں لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کے گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال لائل پور میں ہی گزارے۔ اس کے بعد لاہور پہنچ کر ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد اپنے نام کے ساتھ ''راوین'' لکھنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس زمانے میں مسلمان گھرانوں کے نوجوانوں میں سیاست میں حصہ لینے کا زیادہ رجحان تھا لیکن اس لڑکے نے اپنے لیے اس دور کے حوالے سے الگ مگر ایک کٹھن شعبے کا انتخاب کیا۔ ہماری مراد شوبزنس سے ہے، اس لڑکے نے اپنے شوق کی ابتدا بطور براڈکاسٹر، ریڈیو پاکستان سے کی۔ نت نئے تجربوں کے حصول کے لیے پہلے ریڈیو آسٹریلیا کی جانب رختِ سفر باندھا پھر وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد بی بی سی سے ناتا جوڑا۔ انھی دنوں لندن کے تاریخی رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس سے اداکاری میں ڈگری حاصل کی اور ۱۹۶۵ء میں واپس وطن آ گیا۔ اس وقت کے ایام کے مطابق نامساعد حالات اور عوام کی محدود دلچسپی کے باوجود پاکستان میں سنجیدہ تھیٹر کی روایت قائم کرنے کی غرض سے لاہور اور کراچی میں دو تھیٹرز کی داغ بیل ڈالی جن کے تحت معیاری اردو اور انگریزی ڈرامے پیش کیے لیکن ان تمام کاوشوں کے باوجود اس کے اپنے شوق کی تکمیل نہ ہو سکی اور یوں پھر دوبارہ برطانیہ چلا گیا وہاں جا کر پہلے فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ادا کیے۔ پھر لندن ہی میں اتفاقاً معروف ڈرامے A passage to India میں ڈاکٹر عزیز کا کردار ادا کیا۔ اس کردار کی کامیابی نے اس شخص کو برطانوی تھیٹر کے بہترین اداکاروں کی صف میں شامل کر دیا اور اس ڈرامے کی کامیابی کی بناء پر لندن میں بے شمار کلاسیکی اور ہم عصر مصنفین کے لکھے ہوئے ڈراموں میں اداکاری کا مظاہرہ کیا لیکن پھر دوبارہ وطن کی یاد ستائی اور یوں پاکستان ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور یعنی ۱۹۷۰ء میں پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی شخص کے نام سے شو شروع کیا گیا۔ انھی دنوں اس شخص کو پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز آرٹس اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنایا گیا اور یوں اس شخص کی سرپرستی کے نتیجے میں اہلِ فن کا ایک ایسا شاندار طائفہ وجود میں آیا جس کے پاکستانی رقص اور گیت دنیا کے مختلف ممالک میں مقبول ہوئے اور پاکستان کو ناہید صدیقی جیسی شہرہ آفاق کتھک رقاصہ ملی۔ سات سال بعد یعنی ۱۹۷۷ء میں یہ شخص دوبارہ برطانیہ لوٹ گیا جہاں وہ تاحال مقیم ہے اور وہاں جا کر مسلسل دس برس تک ٹی وی Here and Now کے نام سے اپنا پروگرام پیش کیا۔ آج کل اس شخص کا تخلیق کیا گیا ڈرامائی سیریل Family Pride سیٹلائٹ ٹیلی ویژن پر پاکستان



میں دکھایا جارہا ہے۔ یقیناً پہچان گئے ہوں گے، اس شخصیت کو دنیا ضیاء محی الدین کے نام سے جانتی ہے۔ وہی ضیاء محی الدین جس نے ابتداء میں پیٹر اوٹول کے مقابل مشہور زمانہ فلم The Lawerence of Arabia میں ایک کردار ادا کیا اور آج جب Immaculate Conception میں مرکزی کردار جو کہ ہیجڑے کا تھا، کیا تو چاروں طرف اس کے فن کی دھوم مچ گئی۔ اس فلم میں اس کے ساتھ مشہور زمانہ آرٹ اور کمرشل فلموں کی کلاسیکل اداکارہ شبانہ اعظمی تھی۔ پی ٹی وی کے پہلے اسٹیج شو ضیاء محی الدین شو کی بدولت ہمیں مایہ ناز اور معروف کمپیئر معین اختر اور معروف پاپ گلوکار عالمگیر کے ساتھ ساتھ کئی ایسے نام ملے جو آج اپنے اپنے فن میں یکتا نظر آتے ہیں لیکن ان تمام صفات کے باوجود ضیاء الدین کا اصل فن معروف ادباء اور شعراء کے منتخب کلام کو تحت اللفظ میں پڑھنا ہے۔ ضیاء محی الدین کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اظہار پر یکساں عبور حاصل ہے اور انہوں نے نثر اور نظم کو ایک



close up

NET PLAYHOUSE
8:30 (28) (47)

A PASSAGE TO INDIA

The late E.M. Forster's memorable novel "A Passage to India" is the source for this absorbing study of social barriers.

Set in the 1920s, the drama opens in India with the arrival of Mrs. Moore, an Englishwoman who is visiting her son Ronald and his fiancee Adela. Interested in learning about India, the two women become friendly with a young Indian doctor—a casual breach of the racial barrier that rapidly becomes a choking knot of bigotry and shattered friendships.

"A Passage to India" is considered to be Forster's masterpiece, and attests to his gift for characterization and subtlety in plot, wit and irony. This BBC production is based on Santha Rama Rau's 1962 Broadway play, adapted for TV by John Maynard.

Cast . . . Mrs. Moore: Sybil Thorndike. Dr. Aziz: Zia Mohyeddin (re-creating his stage role). Fielding: Cyril Cusack. Adela: Virginia McKenna. Qasim Ali: Ishaq Bux. Prof. Godbole: Michael Bates. Ronald: Ronald Hines. (Rerun)

Zia Mohyeddin and Virginia McKenna

خاص انداز میں پڑھ کر سنانے کی روایت کو اردو میں متعارف کرا کے اردو زبان سے اپنی غیر معمولی محبت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان سے مجھے عشق ہے۔ ضیاء محی الدین ۱۹۸۶ء کے بعد سے اب تک ہر برس پاکستان آرہے ہیں اور لاہور اور کراچی جیسے بڑے بڑے ادب پرور شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ضیاء محی الدین اپنے اسی فن کے مظاہرہ کے لیے بہاول پور تشریف لائے جہاں باذوق سامعین ان کی ملکوتی آواز میں منتخب شعری ادب کے شہ پارے سماعت فرمانے کے لیے ہمہ تن گوش اور چشم براہ تھے۔ اس موقع پر ہم نے ضیاء محی الدین سے گفتگو کی۔ ہم آپ کو ان کی چند چھوٹی چھوٹی باتیں بتادیں کہ ضیاء محی الدین نے ایک زمانے میں کئی پاکستانی فلموں میں بھی کام کیا اور ان پر اپنے وقت کے معروف گلوکار احمد رشدی کے شوخ و سنگ گانے بھی فلمائے گئے۔ انگریزی اخبار The News میں پندرہ روزہ کالم بعنوان The Zia Mohyeddin Column لکھتے ہیں۔ موصوف نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی ایک غیر معروف خاتون

سے، پھر معروف کتھک ڈانسر ناہید صدیقی سے شادی کی۔ آج کل لاہور میں تیسری شادی بھی ایک غیر معروف خاتون سے کی ہے۔ پہلی دو بیویوں کو طلاق دی ہوئی ہے۔ بہاول پور میں اپنے قیام کے دوران فرمائش کر کے بھنڈی پکوائی، جس سے معلوم ہوا کہ کھانے میں بھنڈی ان کی مرغوب غذا ہے۔ منتخب شاعری اور نثر کے شہ پارے پڑھنے میں کامیاب ہونا اس بات کی دلیل بھی ہے کہ انھیں اردو ادب پر مکمل دسترس ہے اور جس کے باعث وہ اپنے فن میں اتنے کامیاب ہیں کہ ان کے فن کی اختتامی حد کہیں نظر نہیں آتی۔ قارئین اب ضیاء محی الدین کی وہ باتیں بھی پڑھیے جو انہوں نے ہمارے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کیں۔



س: جب آپ ایم اے کے طالب علم تھے تو اس دوران آپ کے من میں کیا سمائی کہ آپ نے آسٹریلیا کا رُخ کیا؟

ج: میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کر رہا تھا جب میں باہر آسٹریلیا گیا۔ وہاں مجھے سخت تحریک ہوئی کہ میرا زندگی کا مقصد جو ہے وہ صرف اور صرف تھیٹر ہے اور مجھے ساتھ ہی شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اس کے بارے میں آتا نہیں ہے۔ سو میں نے باقی تمام چیزوں کو خیر باد کہہ کے انگلستان کا ارادہ کیا اور انگلستان چلا گیا۔ جہاں میں نے تربیت حاصل کرنے کے لیے ایک ادارے ''رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ'' میں داخلہ لے لیا۔ جب وہاں سے فراغت ہوئی تو اس کے بعد میں اس پیشے میں آ گیا۔ شروع میں ظاہر ہے کہ چھوٹے موٹے کردار ملتے تھے پھر جب قسمت نے یاوری کی اور کوئی اتفاق ایسا ہو گیا ،کسی بزرگ کا دین ہو گیا تو پھر ایک ایسا کھیل ملا جو اس وقت کی ضرورت کے حساب سے خاصا مقبول ہوا اور اس میں میرا کام بھی سراہا گیا اور وہ بہت دن چلا بھی تو اس وجہ سے میرے لیے گویا جو دشواریاں تھیں، بیروزگاری تھی وہ سب کم ہو گئیں پھر مجھے لوگ پیشکش کرنے لگے کہ آپ فلاں فلاں چیز کریں۔ چالیس سال سے اس پیشے میں ہوں، اسی میں تھوڑی بہت ساکھ ہے اور اسی سے میں دو وقت کی روزی کماتا ہوں اور اب تک یہ سوچتا ہوں کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم ان کی بلندیوں اور چوٹیوں تک پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ نظر تو نہیں آتا تاہم بلندیوں کی تلاش میں زندگی بھر خود کو آزماتا رہا ہوں۔

س: آپ نے نظم اور نثر کو اپنی آواز میں پڑھنے کی مغربی روایت کو اردو میں متعارف کرایا تو آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟

ج: یہ اس لیے آیا کہ میں ولایت میں انگریزی میں اس طرح کی چیز کر رہا تھا۔ وہاں کے نیشنل تھیٹر میں کر رہا تھا تو اس وقت یہ احساس ہوا کہ بھئی ہمارے ہاں بھی تو بہت اچھی اچھی چیزیں اور ہمارے ہاں اکثر لوگ غزلیں اور نظمیں تو پڑھ دیتے ہیں۔ ایک تو نظم پڑھنے کا وہ طریقہ ہوتا ہے جو ''انجمن حمایت اسلام'' کے جلسوں میں ایک پرانی روایت ہے۔ دوسرے یہ مشاعروں کا طریقہ ہے لیکن کیوں نہ اس طریقے سے نظم، غزل یا شاعری کو پڑھا جائے کہ جس سے وہ تاثر جو شاعر کے دل میں ہے، وہ قائم ہو سکے تو یہ اپج کہہ لیجئے یا تحریک، اسی باعث مجھے اس چیز کا خیال آیا چنانچہ سب سے پہلا جو میں نے ایک (rapporteur) تیار کیا تو اس سے مراد میں نے جو مجموعہ تیار کیا جس میں کچھ نثر کے حصے ہیں اور کچھ نظم کے حصے تھے۔ اچھا یہ نظم کے حوالے سے میں گزارش کر رہا تھا لیکن ہمارے ہاں اصل میں نثر کا کوئی رواج تھا ہی نہیں، سو میں نے سوچا کہ چند خوبصورت خوبصورت نمونے نثر کے جن میں صرف زبان، زبان کا بہاؤ اور زبان کے چونچلے جن سے اب لوگوں کو واقفیت نہیں رہی بلکہ ایک پورا جو عہد ہے، جس کی عکاسی ہو جاتی ہے کسی نثر پارے میں۔ تو مقصد تو یہی ہے کہ جو سننے والے ہیں کچھ چیزیں ان کے لیے مانوس ہوتی ہیں، کچھ غیر مانوس ہوتی



ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ان چیزوں کو پڑھا تا کہ لوگوں کو یاد آئے اور کچھ کو یاد رہ جائے کہ ہاں مجھے یاد پڑتا ہے یہ تو میں نے کبھی بچپن میں یا کئی سال پہلے پڑھا تھا اور غیر مانوس چیزوں کو سننے کے لیے ان میں ذرا زیادہ سی سکت پیدا ہو جاتی ہے ورنہ اگر آپ کوئی چیز پڑھیں جس سے ان کی تھوڑی بہت شناسائی ہو تو کان بھی سن لیں گے لیکن جو چیز ان کے کان میں پڑی ہی نہ ہو تو ممکن ہے وہ سوچ رہے ہوں کہ ارے کل دھوبی کا حساب بھی کرنا ہے، اخوہ وہ آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ محلے کی ٹینکی خراب ہے، میں اس کا کیا کروں ہر طرح کے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ لوگوں کی توجہ اس حد تک اپنی گرفت میں رکھنا، یہی میری کوشش رہتی ہے تو جب اس میں کبھی کبھی کامیاب ہو جاتا ہوں تو بہت تسکین ہوتی ہے اور بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔

س: جب آپ ولایت سے واپس دوبارہ پاکستان آئے، اُس وقت یہاں کیسا ثقافتی ماحول تھا؟

ج: میں ۱۹۵۶ء میں عارضی طور پر واپس آیا تھا کیونکہ میرے والد کو بہت شدید دل کا دورہ پڑا تھا اور اس زمانے میں اتنے ہسپتال بھی نہیں تھے تو میں اس سلسلے میں یہاں آیا تھا اور میں تو صرف دو ڈھائی ماہ کے لیے آیا تھا اور جس دن میں نے واپس جانا تھا تو اس دن کی صبح راستے میں مجھے ایک صاحب ملے جو موٹر سائیکل پر سوار تھے انہوں نے کہا کہ آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ اس لیے کھائیں کہ میں آپ کا بہت پرانا آسٹریلیا کا دوست ہوں وغیرہ وغیرہ اور جب رات کے کھانے پر انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ یہ ایک کھیل ہے اسے آپ ضرور ہدایات دیں۔ میں نے وہ کھیل لیا اور وہ کھیل مجھے بہت اچھا لگا اور اس کھیل کی ہدایات دینے کی وجہ سے کم وبیش سوا دو سال یہاں رہ گیا۔ وہ کھیل تھا ''لال قلعے سے لالو کھیت تک'' جو خواجہ معین الدین کا لکھا ہوا تھا۔ بہر حال اسی زمانے میں دو اور تھیٹرز کی داغ بیل ڈالی تھی۔ میں ہر دو مہینے میں ایک نیا کھیل کرتا تھا۔ اس زمانے میں بہت سے پاپڑ بیلے ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ایک چیز ہے۔



س: آپ نے پی ٹی وی کے ابتدائی دور میں ضیاء محی الدین کے نام سے ایک کامیاب سٹیج شو کیا تو اس زمانے میں اس شو کا مرکزی خیال آپ کا تھا یا کسی اور کا؟

ج: دراصل اس زمانے میں مجھ سے لوگوں نے کہا کہ آپ ٹیلی ویژن کے لیے کچھ کریں تو میں نے سوچا کہ ایک چیز جو یہاں ابھی شروع نہیں ہوئی ہے جس کو ٹاک شو کہتے ہیں یا جیسے Chat Show کہتے ہیں جس میں اور چیزوں کی بجائے گفتگو کی صورت میں لوگوں کو تفریح فراہم کی جائے اور اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ باقاعدہ کچھ لکھوائیں اور اس کی تشکیل کروائیں۔ تو اس شو کا یہ مقصد تھا اور اس شو کو لوگ اب تک محبت سے یاد کرتے ہیں۔ اصل میں لوگوں کا حافظہ اچھا ہے حالانکہ وہ شو اتنا اچھا نہیں تھا۔

س: اس شو میں آپ ایک خاص جملہ ''ٹھیکا'' بھی تو بولتے تھے؟

ج: اصل میں ہر طرح کے پروگرام کے کرنے میں کچھ چیزیں یا کچھ جزئیات کو ڈالنا پڑتا ہے۔ اس پروگرام میں دو عنصر یا چیزیں لوگوں کو پسند آئیں۔ ایک یہ کہ ہمیشہ لوگوں کو حیران کرنے کے لیے اس طرح کی شخصیت کو بلایا جاتا تھا، کوشش رہی تھی جن کو ہمارا معاشرہ بھلا چکا تھا اور دوسرا یہ کہ گویا سنگت کے ساتھ شاعری پڑھی جائے۔ سنگت کاہے کی؟ ظاہر ہے طبلے کی ہوتی تھی تو طبلے میں ایک خاص لفظ ہے ''ٹھیکا'' دیجیے، میں بھی ''ٹھیکا'' دیجیے کہتا تھا تو یہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ ہماری شاعری میں بھی تو ''ٹھیکا'' ہی ہے۔ دیکھیے نا کہ اگر آپ کہیں (اس موقع پر ہمیں ضیاء محی الدین نے ''ٹھیکا'' دینے کا عملی مظاہرہ دکھاتے ہوئے سُر میں سناتے ہوئے کہا) دھا دھن دھنا، دھن دھن دھا یا ایک دو تین چار پانچ یا پھر آ گرا اس کی بجائے سرگم میں یوں کہیں کہ ''جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں'' یہ بھی تو ''ٹھیکا'' ہی چل رہا ہے۔ بھئی ہماری تمام روزی جو ہے وہ ایک طرح سے طبلے کی دھن سے مماثلت رکھتی ہے یعنی طبلے میں تالیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تالیں ہوتی ہیں جب ہماری شاعری آزاد بن جاتی ہے تو وہ یوں کہ ایک مصرعہ چھوٹا سا ہو گیا اور ایک مصرعہ بڑا ہو گیا جیسے

تو مری جان میرے ساتھ کہاں جائے گی

راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے

یا پھر

راہ گزر، راہ گزر، شیشہ مئے، شیشہ مئے

تم نہ آئے تھے

ایک مصرعہ چھوٹا ہو گیا لیکن وزن تو اس کا وہی رہتا ہے نا اگر وہ نہیں کریں گے تو پھر اس کو آج کل کی زبان میں نثری شاعری کہا جاتا ہے جس میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کو پسند نہ آئے۔ میں نے خود ابھی تک اس میں کوئی ایسی بڑی چیز دیکھی تو نہیں ہے۔

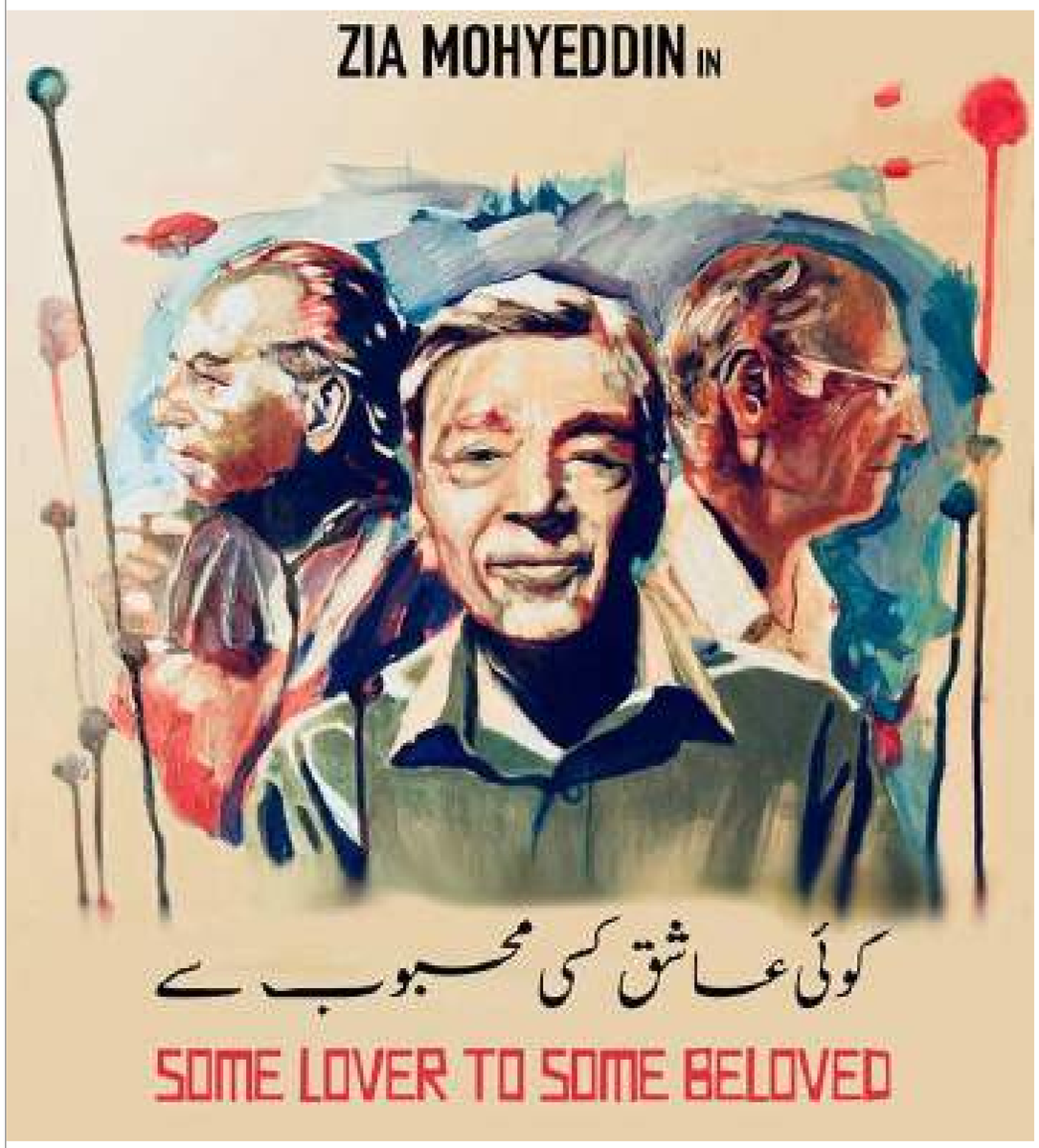


س: ہمیں یاد ہے کہ آپ نے اپنے ابتدائی دور میں ایک فلم بھی تو بنائی تھی؟

ج: جی ہاں میں نے پہلے عرض کیا کہ میں نے بہت پاپڑ بیلے اور ہر طرح سے، میں نے اپنے آپ کو آزمایا کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ تجربہ کیسا رہے گا۔

س: لیکن شاید وہ فلم فلاپ ہوگئی تھی؟

ج: میرا یہ بھی ایک تجربہ تھا اور چیزیں بہت سی ہوتی ہیں جس میں اگر کوئی تخلیقی فنکار کوشش کرتا ہے تو ۱۰۰ میں سے ۹۰ فیصد چیزیں بالکل اوسط سے بھی کم درجے کی ہوتی ہیں، اکا دکا کوئی چیز ہوتی ہے جو صحیح نظر آتی ہے۔



س: آپ کے نزدیک کسی بھی نثر پارے یا شاعری کو تحت اللفظ میں پڑھنے کے لیے انتخاب کا کیا معیار ہوتا ہے؟

ج: دو معیار۔ ایک تو یہ کہ خود مجھے وہ چیز اُکسائے اس حد تک کہ میں سوچوں کہ میں اس کو کرنا چاہتا ہوں ورنہ اب بے شمار لوگ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں کہ آپ اسے پڑھیئے فلاں چیز پڑھیئے یہ بھی پڑھیئے۔ دوسری چیز یہ

اس میں اتنی جاذبیت ہو اور اتنا اس کے اندر خود وزن ہو کہ لوگوں کی توجہ جس حد تک ہو سکے کھینچ سکے۔ یہ دو معیار ہیں لیکن ظاہر ہے انتخاب میرا ذاتی ہوتا ہے۔

س: پچھلے دنوں ہمیں ایک اخبار کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ نے تیسری شادی کر لی ہے تو کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟

ج: (ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے) جی ہاں صاحب یہ بالکل ذاتی سا سوال ہے اور یہ بالکل صحیح خبر ہے کہ میں اب اس رشتے سے منسلک ہو گیا ہوں۔

س: آپ کی سابقہ بیوی ناہید صدیقی بھی تو ہمارے ملک کی بہت بڑی پرفارمر ہیں۔

ج: جی ہاں بالکل ان کا بہت بڑا رتبہ ہے، وہ بہت باکمال ہیں بلکہ پورے ملک میں ان جیسا کوئی اور فنکار ہے ہی نہیں بلکہ کوئی بھی اس شعبہ میں ان جیسا نہیں ہے لیکن زندگی بہت عجیب وغریب شے ہے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے Life is a bitch اب زندگی میں معلوم نہیں کتنی چیزیں ہوتی ہیں اور کتنی چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ ایک رشتہ ہوتا ہے اور ایک نہیں ہوتا ہے اور اس میں کس کا کیا قصور ہے، یہ سب باتیں آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ یعنی میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جی ہاں بالکل، میں اب ایک نئے رشتے سے منسلک ہوں اور ظاہر ہے کہ انسان ہمیشہ اس طرح کا قدم تبھی اٹھاتا ہے جب وہ سوچتا ہے کہ یہ چیز میرے لیے یا یہ چیز ہم دونوں کے لیے خوش آئند ثابت ہوگی۔

س: تحت اللفظ کی تاریخ میں نظر دوڑائی جائے تو ہمیں سب سے پہلے معروف براڈ کاسٹر زیڈ اے بخاری مرحوم اور پھر آپ کا نام سرفہرست نظر آتا ہے لیکن یہ کام اتنا مشکل ہے کہ ہمیں اب پاکستان مین آپ کے علاوہ کوئی اور مستند نام نظر نہیں آتا۔

ج: اب دیکھئے کہ میں نے سنا ہے کہ مجھے دیکھتے ہوئے اور سنتے ہوئے بہت سے لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور اب دیکھیں کہ کب جا کر ان کا انداز اس حد تک منفرد ہو جائے گا کیونکہ اصل بات تو یہی ہے لیکن میں نے سنا ہے اور یقیناً مجھ سے زیادہ بہت باکمال لوگ اس میں موجود ہیں کیونکہ میں تو اپنی سوچ کے مطابق ایک چیز کرتا ہوں۔ مجھے نہ کبھی یہ زعم کہ میں بہت بڑھیا کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ دل جانتا ہے اور میں کر سکتا ہوں اور میں اتنی حد تک بھی کسر نفسی سے کام نہیں لے سکتا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میرا ایک تجربہ ہے جو میرے کام آتا ہے۔



س: آپ کا تعلق دنیا کے بڑے نشریاتی اداروں سے رہا ہے اور آپ کا شمار ہمارے ملک کے چند انتہائی پڑھے لکھے اور باخبر فنکاروں میں ہوتا ہے، اس لحاظ سے اب آج کل جو ہمارے ملک میں سیاسی بحران برپا ہے اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔

ج: (ٹھنڈا سانس بھرنے کے بعد گویا ہوئے) آپ ان لوگوں سے پوچھیئے جو روزانہ بتاتے ہیں کہ ہمارے

پاس حل موجود ہے۔حل کسی چیز کا آسان نہیں ہوتا۔جس دن اس ملک کے لوگوں کو یہ خیال آیا کہ وہ مقصد جو ہمارا تھا شروع میں، کہ ہم اپنا ایک ملک بنائیں گے اس لیے کہ ہمیں اپنا ملک بنانے کی ضرورت ہے، وہ اگر مقصد سامنے رکھیں تو پھر ترقی ہوگی ورنہ یہ ملک اسی طرح چلتا رہے گا۔

س: آپ نے پچاس کی دہائی میں ملک میں سنجیدہ تھیٹر کی بنیاد رکھی لیکن ہمارے آج کے تھیٹر کی روایت اس سنجیدہ تھیٹر سے بالکل مختلف ہے۔آج کل تھیٹرز میں لافٹرز لینے والے اور جگت بازی کرنے والے فنکاروں کا بول بالا ہے تو اس صورت حال پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

ج: یہاں پر تھیٹر کا چرچا تو بہت ہے جو تھیٹر لاہور، کراچی، ملتان، حیدر آباد اور بہاول پور جیسے شہروں میں چل رہا ہے وہ ایک خاص طرح کی نوٹنکی ہے اس میں لوگوں کو اپنے خاص طرح کے جذبات کی تسکین تو مل جاتی ہے۔خاص طرح کے جذبات، سفلی سے سفلی جذبات کی تسکین اگر آپ کو حاصل کرنا ہے تو آپ جا کر آج کل کا تھیٹر دیکھئے لیکن مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کو یہ چیز بہت گوارا ہے کیونکہ لوگ دن بھر کے تھکے ہارے ہوتے ہیں، وہ ذہن پر کوئی بوجھ نہیں لادنا چاہتے لہٰذا آپ کو ہلکی پھلکی مزاح کی چیزیں ملنی چاہئیں لیکن میرے خیال میں اب ہمارے ہاں مزاح کی نہیں بلکہ ذوق کی کمی ہے تو میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔



سینئر صحافی خالد خلیل سید، مصاحبہ کار اور ایڈیٹر "حقیقت" سعید احمد سرکٹ ہاؤس بہاول پور میں ضیاء محی الدین کے ہمراہ

زہرانگاہ

زہرا نگاہ جن کا اصل نام فاطمہ زہرا ہے، ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء کو شعروسخن کی بستی ''بدایوں'' میں پیدا ہوئیں۔ زہرانگاہ کے آباؤاجداد تلاشِ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں آباد ہوگئے تھے۔ زہرانگاہ کی چھ بہنیں اور چار بھائی ہیں اور ان کے خاندان کا ہر فرد اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔ زہرانگاہ خود ایک ممتاز شاعرہ ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد زہرانگاہ اپنے خاندان کے ساتھ حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے کراچی آگئیں اور یہیں اپنی تعلیم مکمل کی۔ زہرانگاہ کو شعروسخن ورثے میں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء زمانہ طالب علمی سے ہی شروع کر دی تھی۔ ابتدائی دور میں پاکستان میں بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جن میں وہ بھی برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ ان مشاعروں میں جب زہرانگاہ اپنا کلام ترنّم سے سناتیں تو محفل میں سماں بندھ جاتا، اور ''واہ واہ سبحان اللہ'' سے پنڈال گونج اُٹھتا تھا اور جب وہ اپنا کلام سنا چکتیں تو سامعین کا پرزور اصرار ''ایک اور ایک اور'' ہوتا تھا۔ کلام کے ساتھ ساتھ زہرانگاہ کی آواز میں بھی بڑا سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ''جدید اردو غزل'' میں زہرانگاہ کا اپنا ایک معتبر مقام ہے ان کی شاعری میں انفرادیت ہے جس کی خصوصیات بے پناہ خلوص اور تاثر سادگی اور پرکاری اور سب سے بڑھ کر اس کا سیاسی رنگ ہے جو اب پختہ تر ہو گیا ہے۔ گل و بلبل، وطن اور چمن، رہبر اور رہزن، قفس اور آشیانے کے پردے میں وہ بڑے بڑے سیاسی حقائق بیان کر جاتی ہیں اور سیاست پر بھرپور طنز کرتی ہیں، جس کا اثر عرصہ تک زائل نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ پاکستان کی مقبول ترین شاعرہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ زہرا نگاہ کے اب تک تین مجموعہ ہائے کلام ''شام کا پہلا تارہ''، ''ورق'' اور ''فراق'' شائع ہو چکے ہیں۔





س: زہرا! آپ نے چودہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اس زمانے میں ادب کے میدان میں خواتین کی آمد بہت کم ہوتی تھی تو ذرا بتایئے کہ کیسا ادبی ماحول تھا اس زمانے میں؟

س: اصل میں بات یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ عورتیں نہیں نکلتی تھیں کیونکہ بہت ساری خواتین ادب کے میدان میں تھیں۔ پھر ترقی پسند مصنفین کی جماعت نئی نئی اُبھر رہی تھی اور اس میں بہت ساری خواتین لکھ رہی تھیں۔شروع میں رشید جہاں اس کے بعد عصمت آپا، اس کے بعد بہت ساری خواتین شاعری میں البتہ کم تھیں لیکن ادا جعفری کا پہلا جو دیوان تھا۔ میرے خیال میں ۱۹۴۶ء میں یا ۱۹۴۷ء میں چھپا اور اس کا قاضی عبدالغفار نے دیباچہ لکھا تھا، جو اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔لیکن میں نے اگر کچھ کام کیا تو وہ یہ کیا ہے کہ میں نے شانہ بشانہ مرد شاعروں کے ساتھ جا کر مشاعرے میں شرکت کی۔اس سے پہلے شاید کچھ خواتین نے کی ہو، لیکن انھوں نے پردے میں کی ہوگی تو میں نے جب مشاعرے میں جا کر پڑھنا شروع کیا اس وقت تک زیادہ خواتین آتی نہیں تھیں یا پردے میں بیٹھ کر سنتی تھیں یا حاضرین میں بیٹھتی تھیں، پھر پاکستان بننے کے بعد بڑے اچھے اچھے مشاعرے ہوئے ہیں۔ بہت عمدہ بہت اعلیٰ اگرچہ انتظامات وغیرہ بہت سادہ ہوتے تھے۔صرف میں اسٹیج پر بیٹھنے سے ذرا گریز کرتی تھی پہلی لائن میں بیٹھ جاتی تھی اور ناظمِ مشاعرہ سے کہہ دیتی تھی کہ جب میرا نمبر آئے تو آپ مجھے ایک شاعر سے پہلے اسٹیج پر بلا لیجئے گا۔اس زمانے میں ماحول ایسا تھا کہ نوجوان شعراء اور بزرگ شعراء، سب نے میری بڑی پذیرائی کی اور سب نے بڑی عزت، محبت اور احترام کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ مجھے تو کوئی نہ کسی قسم کی کبھی شکائت ہوئی اور نہ ہی کسی نے میرے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔سب نے بڑے عزت و احترام کے ساتھ مجھے سنا اور مجھے بے حد

پذیرائی ملی۔ ہوتا یہ ہے کہ شروع شروع میں جب آدمی شعر کہتا ہے تو اپنے اوپر کم بھروسہ محسوس کرتا ہے، لیکن یہ ہے کہ پھر فوراً ہی میرے مشاعرے میں جانے کے بعد اس وقت جو مقتدر اور معتبر رسالے تھے مثلاً ''سویرا'' تھا۔ الہٰ آباد سے ''نئی زندگی'' نکلتا تھا ''شاہراہ'' نکلتا تھا اور ''فنون'' بعد میں آیا ''نقوش'' تھا ان سب میں میری غزلیں چھپی تھیں۔ اس سے مجھے بڑی ڈھارس ہوئی اور حوصلہ افزائی ہوئی کہ بھئی اچھا شعر ہے نا کچھ ہے اس میں جبھی تو یہ لوگ چھاپ رہے ہیں ورنہ بہت سارے میرے ساتھ کے شاعر ایسے بھی تھے جو مجھ سے شکائت کرتے تھے کہ بھئی تمھاری تو غزل چھپ گئی، ہمیں تو اُنہوں نے کہا کہ ابھی اور لکھیئے۔ اس طرح کی باتوں سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور پھر گھر والوں نے بھی بہت ہمت بندھائی اور اس وجہ سے میں نے شاعری کو ترک نہیں کیا بلکہ اس کو جاری ہی رکھا۔

س: اور یہ سلسلہ ماشااللہ اب تک جاری ہے؟

ج: کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہوں لیکن مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتی ہوں۔ ہاں ادبی میلوں میں ضرور شرکت کرتی ہوں اور ان میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ لوگ بھی بڑے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں نا کہ ''تھالی پھینکو تو سروں پر جائے'' اس طرح سے لوگ جمع ہوتے ہیں تو ان حالات میں جب پاکستان وقتی طور ایک نہایت مشکل دَور سے دو چار ہے، ایسے ماحول میں ادبی جلسے یا ادبی میلوں کا انعقاد بڑی خوش آئند بات ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں میں ابھی جینے کا، شعروادب کو سننے کا اور اپنی تہذیب کو جاننے کا شوق ہے۔

س: آپ کے گھرانے کا ہر فرد اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے تو جب اس کہکشاں کے تحت سارے ستارے اکٹھے ہوتے ہیں تو گھر کا کیا ماحول ہوتا ہے؟

ج: وقت وقت کی بات ہے کہ جس زمانے میں ہم پلے بڑھے، اس زمانے میں گھر میں عام طور سے ہم نے ایک ادبی ماحول دیکھا۔ جس کی وجہ سے ہم میں یہ ہمت پیدا ہوئی یہ ذوق پیدا ہوا اور جب سارے اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر انور ہنساتے ہیں۔ کبھی ہم لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کبھی پیروڈی بھی کر دیتے ہیں میرے اشعار کی اور آج کل تو وہ ڈراموں میں مصروف ہیں ان کے ڈرامے بڑے اچھے ہو رہے ہیں بلکہ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب نصیرالدین شاہ نے یہ کہا کہ پاکستان میں ڈرامے کو ایک اچھی صف میں لانے کے لئے انور مقصود کا بڑا ہاتھ ہے، پھر بجیا ہیں انہوں نے اپنی پوری زندگی ٹیلی ویژن کے لئے وقف کر دی اور جتنے اچھے سیریل انہوں نے دیئے اور جس طرح کے مکالمے انہوں نے لکھے۔ وہ ایک ایک مکالمے پر یقین مانیئے، گھنٹوں محنت کرتی تھیں اس کے بعد وہ اس سے مطمئن ہوتی تھیں۔ پھر سارہ نقوی بی بی سی کی پہلی خاتون براڈ کاسٹر تھیں، جنہوں نے وہاں پر خبریں پڑھیں اور ان کا آج بھی نام بہت محبت اور عزت سے لیا جاتا ہے وہاں پر، کچھ تو اس میں بزرگوں کی دعائیں اور ان کی تربیت بھی شامل تھی۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ یہ



ادا جعفری

خاندانی ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ انور تو تصویر، میرا خیال ہے کہ ۱۴ یا ۱۵ سال کی عمر سے بنا رہے ہیں۔ ان کی تصویروں کی پہلی نمائش فرانسیسی سفارت خانے میں ہوئی تھی اور فرانسیسی سفیر نے اس کا افتتاح کیا تھا کراچی میں اور اس وقت سے وہ تصویر بنا رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ ڈرامے کی طرف آئے اور انہوں نے کراچی ٹیلی ویژن کے بہت لکھا اور بجیا نے بھی ایسا ہی کیا۔ زبیدہ نے کھانا پکانا شروع کر دیا بلکہ میرا ان کا اکثر مذاق چلتا ہے جب وہ مجھے بتاتی ہیں کہ میری Cookery Book کی رائلٹی اتنی آتی ہے۔ آپ کی کتابوں کی کتنی آتی ہے۔ میں نے کہا کہ میری کتابوں کی تو آج تک کوئی رائلٹی مجھے نہیں ملی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھئے میری کتاب کی تو بہت آ رہی ہے تو میں ان کو چھیڑتی ہوں کہ ''شہر میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا'' تم تو آلو بگھار کر اس قدر شہرت حاصل کر رہی ہو۔ ہم چالیس برس سے شاعری کر رہے ہیں اور ہمیں کوئی اس کی رائلٹی وغیرہ نہیں ملی، ہم لوگ ہنستے ہیں آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انور کو بھی میں بہت چھیڑتی ہوں۔ ابھی انور نے ایک جگہ میری نظم ''جنگل کا قانون'' سنائی تو لوگ سمجھے کہ یہ انور کی نظم ہے اور کسی نے اس کو فیس بک پر ان کے نام سے شائع کر دی۔ انور نے کہا کہ تمہاری نظم میرے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں تردید کر دو۔ انہوں نے کہا میں نے سوچا خاندان کا معاملہ ہے تو کون تردید کرتا پھرے۔ اس طرح کا سلسلہ چلتا رہتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ بٹوارہ کے بعد لوگوں نے تکالیف بہت اُٹھائیں اور اس میں ہمارا خاندان بھی شامل رہا لیکن ان تکالیف میں ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ اُمید دلائی تھی کہ آج تکلیف اُٹھا لو، کل آرام ہی آرام ہوگا۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ بات اب ہم اپنے بچوں کے لئے کہتے ہوئے ذرا جھجکتے ہیں لیکن امید تو ابھی بھی باقی ہے۔ دیکھئے ایک مرتبہ ایک ادبی میلے میں مشاعرے کے اختتام پر ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے نے میری تیس پینتیس سال پرانی غزل مجھے یاد دلا دی کہ آپ مجھے وہ سنا دیجئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جو غزل مجھے نہیں یاد وہ اسے کیسے یاد ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھئی یہ تمہیں کیسے یاد ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اپنے گھر میں سنی ہے۔ یقیناً ان کے والد نے یا ان کے کسی عزیز نے اس کو سنائی ہوگی لیکن یہ اس کی خوبی تھی کہ اسے یہ یاد رہی ورنہ آج کل تو صحیح شعر پڑھنا ہی مشکل ہے۔ لوگ گرا دیتے ہیں وزن میں اور انہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔ لکھنا پڑھنا یا شعر و ادب خاص طور سے ایک ہی بات ہے، یہ زندگی کو سنوارنے اور تہذیب کو اُجاگر کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ سائنس کی ترقیاں اپنی جگہ ہوتی ہیں لیکن تہذیبی شعور تو لکھنے پڑھنے سے بیدار ہوتا ہے اور ادب کا بہت بڑا حصہ اس میں شامل ہے۔



اپنے بھائی انور مقصود کے ہمراہ

س: آپ نے دیارِ غیر میں خاصا وقت گذارا لیکن آپ کی شاعری کا انداز آپ کو دیگر خواتین شاعرات سے ممتاز بناتا ہے اور آپ کی شاعری میں غمِ دوراں یا غمِ جاناں کی بجائے اہم عالمی حالات و واقعات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے مثال کے طور پر برِصغیر کی تقسیم کے واقعات، افغانستان کی جنگ وغیرہ، تو اس حوالے سے کیا

فرمائیں گی؟

ج: میں پاکستان سے تقریباً ۱۵ یا ۲۰ سال باہر رہی ہوں۔ شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی اور اپنے میاں کی نوکری کے سلسلے میں وہیں رہی۔ وہاں جا کر Cultural Starvation جسے کہتے ہیں۔ ایک اپنی ثقافت کی، اپنی تہذیب کی زیادہ آدمی کو کمی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اپنی باتیں کرنے والا ہو، اپنے شعر سنائے، کسی کے شعر سنے اور کسی اچھے لکھنے والے کو پڑھے۔ یہ چیزیں تو رہی ہیں لیکن میں یہ بتا رہی تھی آپ کو کہ تقسیم کا جو دکھ تھا وہ بہت گہرا تھا۔ اس میں کئی جانیں بھی ضائع ہوئیں، جو خاندان کے سرپرست تھے وہ اللہ کو پیارے ہوئے لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ میری ماں کا ہم سب کی تعلیم و تربیت میں بڑا حصہ رہا ہے۔ انہوں نے ہم سے یہ بات کہی کہ ناامید کبھی نہ ہونا اور یہ مت سوچنا کہ آج اگر برا ہے تو کل بھی برا ہوگا۔ یہ سوچو کہ کل اس سے بہتر ہوگا، پرسوں اس سے بھی بہتر ہوگا۔ ان کا یہ جو سبق تھا، ہمیں بہت سہارا دیتا اور ایک سروے رپورٹ کے مطابق تقسیم کے بعد وہ خاندان زیادہ اچھے رہے جن کی مائیں زیادہ دیر تک زندہ رہیں کیونکہ ماں سے جو ایک رشتہ ہوتا ہے اس میں محبت کے علاوہ ایک بڑی گہری وابستگی ہوتی ہے۔ باپ تو معاشی سلسلے میں اپنی نوکریوں کے سلسلے میں اتنا وقت اس زمانے میں بچوں کو نہیں دیتے تھے لیکن ہم نے تو جو کچھ سیکھا وہ اپنے گھر کی بزرگ خواتین سے سیکھا۔

س: آپ کی شاعری میں ہمیں اِستعارہ اور تشبیہات کا استعمال بڑا نظر آتا ہے؟

ج: استعارہ و تشبیہات تو ہمارے ہاں شاعری کے زیور ہیں اگر ہم انہیں چھوڑ دیں گے تو ہمارے لئے شاعری کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے لیکن میں کوشش یہ کرتی ہوں کہ مشکل الفاظ کا استعمال نہ کروں، سادہ زبان میں شاعری کروں۔ بہت سی نظمیں میری آپ اگر پڑھیں گے تو اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں لیکن جہاں تک غزل کا سوال ہے اس میں استعارہ اور تشبیہہ کے بغیر کام نہیں چلتا ہے۔ غزل وہ صنف ہے کہ اگر اچھی لکھنا چاہیں تو انگلیاں فگار ہوتی ہیں۔ بری غزل لکھنا چاہیں تو آپ دن میں دس لکھ لیجئے۔



س: آپ ماشاءاللہ ایک طویل عرصے سے شاعری کر رہی ہیں لیکن صرف تین مجموعہ کلام، جبکہ یہاں تو حالات یہ ہیں کہ لوگ ہر چھے ماہ بعد ایک نیا مجموعہ کلام منظر عام پر لے آتے ہیں؟

ج: میں نے خود لکھا بھی بہت کم ہے۔ جب بہت دل چاہا تبھی لکھا ورنہ اگر آپ کو الفاظ کو ترنّم کے ساتھ Rhythm میں پرونا آتا ہے تو پھر شعر لکھنا آپ کے لئے اتنا مشکل نہیں رہتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک اندر سے کیفیت نہ ہو کسی بات سے آپ حد سے زیادہ متاثر نہ ہوں، اپنے ماحول کا اثر آپ کے اوپر نہ ہو کوئی واقعہ کوئی حادثہ آپ کو دیر تک پریشان نہ کرے اس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے غالب نے اچھی شاعری کو تین الفاظ میں بیان کیا ہے عبارت، اشارت اور ادا۔ اگر تینوں باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو پھر شاعری اپنی صورت نکھارتی ہے، سنورتی ہے اور سجتی ہے۔ ذود گوئی ویسے بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے

۔دیکھئے بڑے اچھے اچھے شاعر جو پرانے ہیں جیسے میر، سودا، آتش اور ناسخ وغیرہ، ان سب کی کلیات اگر آپ دیکھیں تو ان کو ہاتھ میں اُٹھانا مشکل ہے۔ان میں سے شعر نکالنا پڑتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کا پورا وقت، ان کا اوڑھنا بچھونا اور ذریعہ آمدنی بھی شاعری ہی تھا، نوکری بھی شاعری کے توسط سے ہی ملتی تھی اس لئے ان کو بہت سارے شعر کہنا پڑتے تھے۔ایک زمین میں کوئی دس غزلیں، کوئی بیس غزلیں اور کوئی پندرہ کہہ رہا ہے لیکن ان کے کلام میں بڑے بڑے آبدار موتی چھپے ہوئے ہیں۔ہم انہیں جب چھانتے ہیں، دیکھتے ہیں، اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ اس میں سے چھان کر نکالا بھی ہے جن کا میں اکثر اپنے اشعار یا تقاریر میں تذکرہ کرتی رہتی ہوں۔

س: فراق گورکھ پوری، جگر مرادآبادی، اور فیض احمد فیض، یہ تینوں اپنے عہد کے بڑے نام تھے اور آپ کی ان تینوں ادبی شخصیات کے ساتھ بڑی نشستیں رہیں، اس حوالے سے اپنی یادوں کے دریچوں سے کچھ تو ہمارے ساتھ شیئر کیجئے؟

ج: دیکھئے وہ تینوں بڑے شاعر تھے۔ بڑا شاعر ہونا بڑی مشکل بات ہوتی ہے۔ برس ہا برس اس میں لگ جاتے ہیں اور اس میں خوش نصیبی بھی شامل ہوتی ہے۔ پھر قبولیت کا جو مرحلہ ہے وہ بڑی دیر میں جا کر پورا ہوتا ہے جیسے فراق صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے تنقید نگار بھی تھے۔اچھا فیض صاحب کا بھی یہی تھا کہ فیض صاحب کی کتاب ''میزان'' اگر آپ پڑھیں تو اُن کی شاعری کی تہہ در تہہ سمجھ آتی ہے کہ وہ کتنے بڑے تنقید نگار تھے۔فیض صاحب نے عربی اور انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا۔فارسی ان کے گھر میں بولی جاتی تھی۔ان تینوں زبانوں پر ان کو کافی عبور تھا۔فراق صاحب کا یہ تھا کہ وہ ان تین زبانوں کے علاوہ سنسکرت سے بھی واقف تھے۔جب آپ اتنی زبانوں سے واقف ہوتے ہیں تو آپ کی شاعری میں ان تمام زبانوں کا رس آجاتا ہے۔ اچھا، جگر صاحب کا یہ تھا کہ انہیں پرانے زمانے کے مطابق عربی، فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری پر عبور حاصل تھا اور اپنے استاد اصغر گونڈوی صاحب کا ان کے اوپر بڑا اثر تھا۔ان کی شاعری



میں آپ کو تصوف کے جو نشانات ملتے ہیں وہ اصغر صاحب کے ہیں اور ہر زمانے میں ہر شاعر اپنے زمانے کے بڑے شاعر کے جادو سے نہیں نکل سکتا، اس کو بڑی مشکل سے توڑ کر اپنے آپ کو نکالنا پڑتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ خود فیض صاحب کہتے تھے کہ ہم سب کے اوپر اقبال اور اختر شیرانی کا بڑا اثر تھا اور ہم نے بڑے دنوں تک ان کی طرح شاعری کرنے کی کوشش کی۔ یہ چیزیں ہوتی ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ لیکن پھر بڑی شاعری ان تمام یعنی سلگتے ہوئے راستوں سے جس میں کانٹے بھی ہیں اور پتھر بھی ہیں، وہاں سے گزر کر پڑھنے والے کے سامنے باغ کھلا دیتی ہے۔

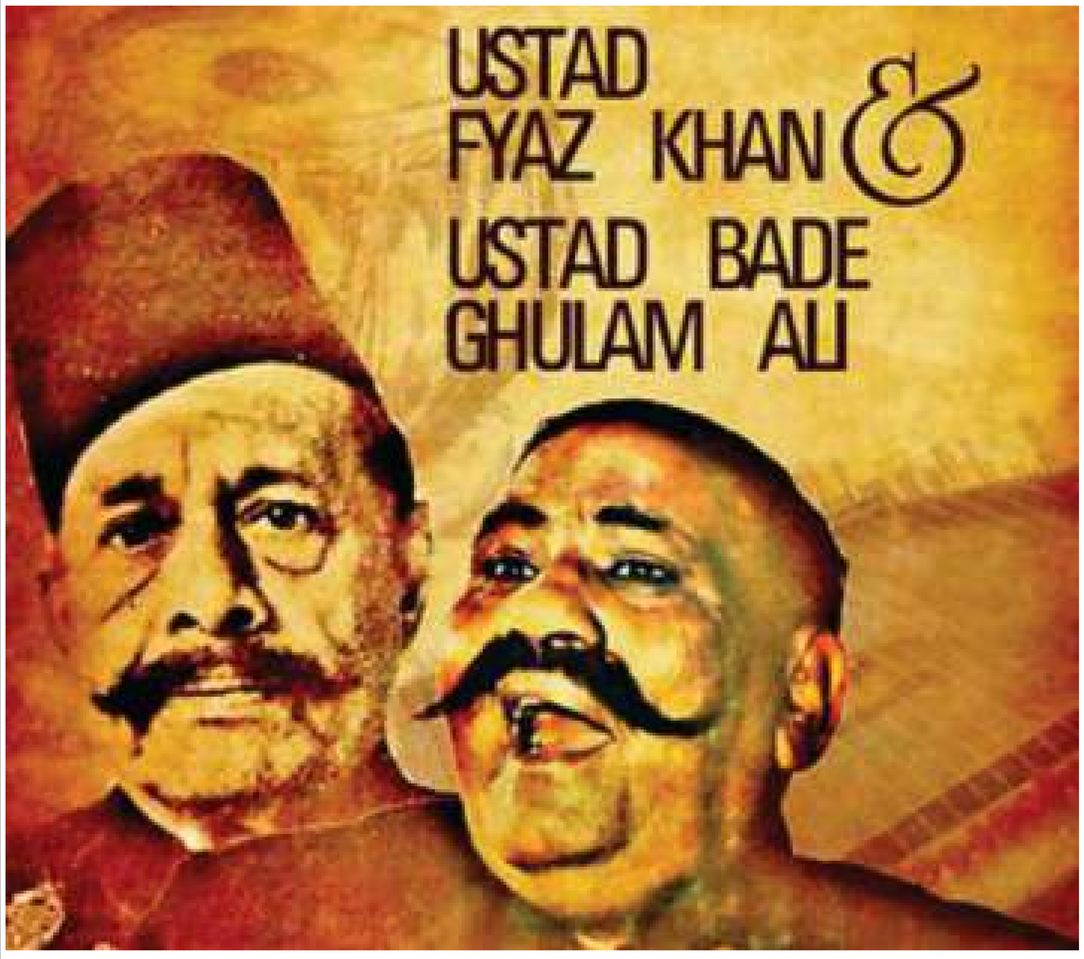
س: زہرہ آپا! آپ کی نظر، پاکستانی اور ہندوستانی منظرنامے پر رہتی ہے، آپ کی نظر میں فنون لطیفہ بشمول شاعری کی بہتر ترویج پاکستان میں ہو رہی ہے یا ہندوستان میں؟

ج: دیکھئے ویسے تو ہندوستان میں موسیقی کے میدان میں بڑی ترقی ہوئی ہے رقص میں بھی وہ بہت اچھے ہیں، آرٹسٹ بھی ان کے بہت اچھے ہیں لیکن میں آپ کو ایک بات بتلا دوں اس میں کوئی خدانخواستہ تعصب کی بات نہیں ہے۔ میرے تو بہت سارے ابھی بھی عزیز دوست ہندوستان میں ہیں اور میں تقریباً کوشش یہ کرتی ہوں کہ ہر سال وہاں کا ایک پھیرا لگا لوں، کبھی کسی سلسلے میں اور کبھی کسی سلسلے میں۔ میرے خیال میں وہاں چونکہ پرائمری کی سطح پر اردو نہیں ہے، یونیورسٹی کی سطح پر ان کے ہاں چیئرز اور پروفیسرز بھی ہیں۔ ڈگریاں بھی مل رہی ہیں لیکن چونکہ پرائمری کی سطح پر زبان ختم ہوگئی ہے اس لئے لوگوں میں شوق ہے لیکن ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ مشاعرے میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں لیکن ایسے شاعر کو بھی سنتے ہیں ،واہ واہ بھی کر لیتے ہیں اور اس کو بار بار بھی سنتے ہیں جس کی شاعری، شاعری کے معیار پر اتنی اونچی نہیں ہوتی۔ پھر بات یہ ہے کہ ترنّم جو ہے وہ بھی بدل گیا ہے۔ دیکھئے ناترنّم کے لئے ہمارے ایک پروفیسر رالف رسل تھے انہوں نے بڑی اچھی بات کی، تھے تو وہ خالص انگریز لیکن اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا



فیض کی زیر صدارت، بی بی سی کا مشاعرہ، زہرہ نگاہ، جمیلہ بانو، احمد فراز، گوپی چند نارنگ، شہرت بخاری اور افتخار عارف

کہ ترنّم جو ہے بڑی مشکل چیز ہے۔ It's not music, It's not even singing.It's a way of present your poetry in a style. کہ آپ کو اس کے Shades جو ہیں جس کو ہم محاکات کہتے ہیں وہ کھلتے چلے جاتے ہیں Experssions کے ساتھ۔ یہ نہیں ہے کہ آپ شعر کو گا رہے ہوں جس میں استھائی، انترہ وغیرہ شروع کر دیا جائے تو موسیقی بھی نہیں اور گائیکی بھی نہیں۔ دیکھئے میں آپ کو ایک مثال دوں کہ ایک جو چھپے ہوئے معنی ہیں وہ بعض اوقات اچھے ترنّم سے واضح ہوتے ہیں اور بُرے ترنّم سے دب جاتے ہیں۔ شاعری کو گانا نہیں چاہیئے۔ اسی طرح سے جیسے بڑے بڑے گویئے جب مرثیے پڑھتے ہیں تو وہ راگ کو جان کر بگاڑ دیتے ہیں۔ کسی نے فیاض خان صاحب سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ کہیں راگ مرثیے پر حاوی نہ ہو جائیں۔ تو یہ چیز ہوتی ہے ترنّم کو شاعری پر حاوی نہیں ہونا چاہیئے۔ ترنّم اتنا ہی ہونا چاہیئے کہ جس سے الفاظ کے معنی کھُلیں۔



س: ابھی آپ نے موسیقی کا ذکر کیا تو یہ فرمایئے کہ فلمی شاعری کو آپ کس درجے پر پرکھتی ہیں؟

ج: میں تو ہر فلمی شاعری کو ایک درجہ دیتی ہوں جیسے مجروح صاحب نے گیت لکھے، شکیل بدایونی نے گیت لکھے۔ انہوں نے تو اتنے خوبصورت گیت لکھے ہیں، اچھا ساحر نے اتنے اچھے گیت لکھے ہیں کہ جو ہر طرح سے ادبی معیار پر پورا اُترتے ہیں۔ اب زمانہ بدلتا جا رہا ہے قدریں بدل رہی ہیں۔ لوگوں کے مزاج بدل جاتے

ہیں۔ابھی ہندوستانی فلم کا آپ حال دیکھ لیجئے کہ سَو میں سے نوّے فلمیں اتنی خراب ہوتی ہیں کہ آپ ان کو دیکھنا نہیں چاہتے۔دس فلمیں ان کی معیاری ہوتی ہیں۔تو اس زمانے میں جس زمانے کی میں بات کر رہی ہوں اس زمانے میں وہاں ساحر تھے، اختر الایمان تھے، مجروح تھے،تو یہ بڑے قد آور لوگ تھے،کیفی اعظمی تھے۔آپ دیکھئے،کیفی بھائی کا وہ جو گیت ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ

جائیں گے کہاں سوجھتا ہی نہیں
چل پڑے مگر راستہ نہیں

یہ شاعری ہے یا پھر

وقت نے کیا ، کیا حسیں ستم
ہم رہے نہ ہم ، تم رہے نہ تم

اب یہ با قاعدہ ایک شاعری ہے۔اسی طرح مجھے جاوید اختر کے گیت بہت پسند ہیں کیونکہ ان کے یہاں الفاظ کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ان کی رگوں میں اور ہڈیوں میں بھی شاعری ہے۔مجاز اُن کے ماموں، جاں نثار اُن کے والد اور مظفر خیر آبادی ان کے دادا۔اب ان کا جیسے معمولی سا گیت ہے کہ

کچھ نہ کہو کچھ بھی نہ کہو
کیا کہنا ہے ، کیا سننا ہے
سمے کا یہ پل تھم سا گیا ہے
اور اس پل میں کچھ بھی نہیں ہے
بس اِک میں ہوں اور اِک تم ہو

تو یہ شاعری ہے۔پھر گلزار،گلزار تو مجھے بے حد پسند ہیں اس وجہ سے کہ گلزار کی زبان اردو نہیں ہے۔انہوں



گلزار

نے اپنی محنت اور کوشش سے اپنے ذہن سے جِلا دے کر اردو زبان سیکھی ہے۔ان کی کہانیوں اور ان کی شاعری میں منظر کشی تو اتنی طاقتور ہے مثلاً بارش کو انہوں نے ''ململ کی پھوار'' کہا ہے۔''ململ جیسی پھوار'' ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں پھر ''چاند کی اٹھنّی'' ان کی نظمیں بہت خوبصورت ہیں۔ میں تو ان کی بڑی قدر دان ہوں اور وہ میرے بڑے اچھے دوست ہیں ان سے جب بھی بات ہوتی ہے بڑی اچھی طرح بات ہوتی ہے بلکہ پچھلے دنوں میں ان کا ایک شعر کسی کو سنا رہی تھی تو کسی نے کہا کہ یہ تو لکھنؤ اسکول معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا نہیں یہ جہلم اور دینہ اسکول ہیں۔ یہ لکھنؤ اسکول نہیں ہے۔ان کا شعر یہ تھا کہ:

ہم تو کتنوں کو مہ جبیں کہتے
آپ ہیں اس لئے نہیں کہتے



گلزار دورۂ پاکستان کے دوران اپنے آبائی شہر دینہ کے ریلوے اسٹیشن پر

س: آپ کے بھائی احمد مقصود حمیدی مرحوم سول سروس سے وابستہ رہے، ادبی میدان کا بھی رخ کیا لیکن انہیں آپ کے دیگر اہلِ خانہ کی طرح وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے؟

ج: احمد ہمارے خاندان کے سب سے پڑھے لکھے آدمی تھے۔کیا انگریزی ادب، کیا اردو ادب اور کیا فارسی ادب۔وہ اپنی جگہ ایک انجمن تھے۔لیکن انہیں اپنے معمولاتِ زندگی اور دفتری الجھنوں اور اپنے کاموں سے اتنا وقت نہیں ملا پھر ان کا مزاج جو تھا وہ صرف ہم لوگوں کے لئے یہ تھا کہ وہ ہماری تخلیقات کی تعریف بہت کرتے تھے۔فون آیا تم نے کچھ لکھا؟ یا کسی نے کچھ بنایا؟ کوئی تصویر نئی بنی؟ انور سے پوچھتے تھے۔ایک طرح سے ہمیں انہوں نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی لیکن وہ خود سامنے نہیں آئے جبکہ ان میں بے پناہ صلاحیت تھی لکھنے کی بھی اور گفتگو کی بھی۔ان کے قریبی دوست اور احباب آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔وہ

کہتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ ان سے سیکھا، وہ کسی سے نہیں سیکھا۔

س: آپ اپنے آپ کو کس طرح بیان کرتی ہیں؟ Fiminism Writer یا Feminist Writer ؟

ج: دیکھئے Feminism جب شروع ہوا تھا اس کی شکل کچھ اور تھی۔ شکلیں بدلتی جاتی ہیں تحریک کی اب تو اس کے اوپر بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ بہت کچھ ہو چکا، جب لوگوں نے مجھ سے بہت کہا کہ آپ اس پر کچھ لکھیں تو میں نے ان کو ایک شعر لکھ کر دیا تھا کہ

یہ کیا طریقۂ سفر ہے کہ ہم رہیں پیچھے
جب ایک راہ پہ چلنا ہے ، ساتھ ساتھ چلو

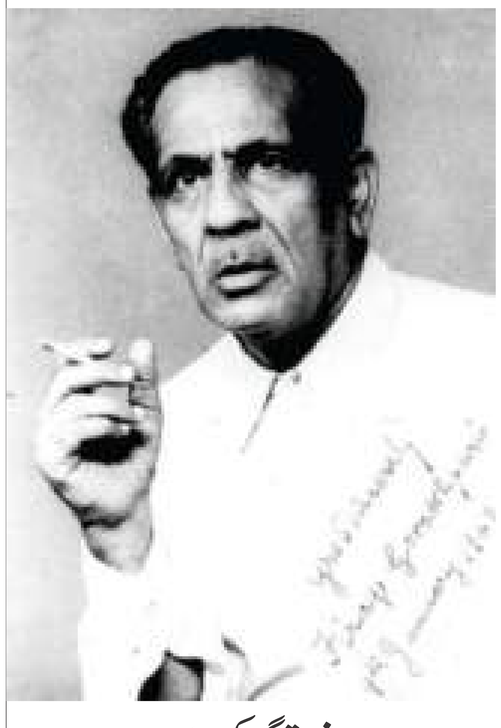
یہ ہے Feminism باقی ظلم وستم اگر عورت پر زیادہ ہوئے ہیں تو عورت کی طرف سے مرد پر بھی کم نہیں ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت نے بڑی مصیبتیں اُٹھائی ہیں اور آج بھی اُٹھا رہی ہے لیکن یہ معاشرے کے اپنے حالات اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ آپ کسی کے لئے کیا درجات متعین کرتے ہیں اور آدمی میں خود کتنی سکت ہے کہ وہ اپنا درجہ کس طرح متعین کرتا ہے۔

س: بات تحریک کی ہو رہی ہے تو 9/11 کے واقعہ نے عالمی ادب پر بڑے اثرات مرتب کئے اس حوالے سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج: اس حوالے سے تو ''ڈرون'' پر میری ایک نظم ہے اور 9/11 پر تو ایک بادشاہ کی پوری کہانی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ لکھنے والے کے اوپر ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان باتوں سے متاثر نہ ہو۔ ہر وقت کا ایک طریقہ اظہار ہوتا ہے اب جیسے غالب کے خطوط ہیں یا غالب کے بعض اشعار ہیں جو کہ پوری ایک مکمل تاریخ ہیں۔ فراق صاحب نے ایک بات لکھی کہ اردو غزل کو آپ اس نظر سے بھی پڑھیئے، اس انداز سے بھی دیکھئے کہ غزل کے اشعار بھی ایک تاریخ مرتّب کرتے ہیں، اس زمانے کی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اردگرد کا جو ماحول ہے، جو اثرات ہیں وہ انسانی ذہن پر مرتّب نہ ہوں۔

س: آپ نے بڑی بھرپور ادبی زندگی گذاری ہے اس حوالے سے اپنی یادداشتیں قلم بند کرنے کا کیا کوئی ارادہ ہے؟

ج: میں نے لکھی ہیں مگر اس کا ایک فیصلہ میں نے یہ کیا ہے کہ میں اس کو چھپواؤں گی نہیں وہ صرف میں نے اپنے بچوں کے لئے لکھ دی ہیں اور ان پر یہ لکھ دیا ہے کہ بھئی اس کو پڑھ لینا اگر تمہیں فرصت ہو اور اس کے بعد اس کو جلا دینا۔ اس لئے کہ آج کل یادداشتیں فیشن کی طرح لکھی جا رہی ہیں اور ہر اس آدمی کے لئے جو چاہتے ہیں وہ بات لکھ دیتے ہیں جو نہ اس کی تائید کر سکتا ہے نہ تردید۔ اس سے بہتر نہیں کہ آدمی اپنا قلم ذرا روک کر لکھے اور وہ بہت ذاتی ہیں، ان کو چھپوانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ میں نے صرف اپنے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔



فراق گورکھپوری



سجاد پرویز

سجاد پرویز کا تعلق بہاول پور سے ہے۔ انہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم اے معاشیات کی ڈگری حاصل کی وہ ریڈیو پاکستان بہاول پور سے بطور ڈپٹی کنٹرولر نیوز منسلک ہیں۔ انھوں نے ۲۰۰۲ء میں سنٹرل نیوز آرگنائزیشن ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے اپنے نشریاتی سفر کا آغاز کیا۔ انھوں نے ۲۰۱۰ء میں اسلام آباد میں دوبارہ تعیناتی کے دوران بطور ٹیم لیڈر سرائیکی زبان میں خبروں کے اجراء کا منصوبہ مکمل کیا۔ اس دوران انھوں نے اسلام آباد میں سارک وزرائے داخلہ کانفرنس اور بھوربن مری میں ماحولیات کے حوالے سے منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس کی خصوصی کوریج بھی کی۔ سجاد پرویز کا شمار ریڈیو پاکستان کے سینئر براڈکاسٹرز میں ہوتا ہے۔ وہ صدر پاکستان، وزیر اعظم پاکستان، وزرائے اعلیٰ و گورنرز اور دیگر قومی و بین الاقوامی اہم شخصیات کی کوریج کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں یوم آزادی کے موقع پر چلائی جانے والی خصوصی آزادی ٹرین میں انھوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے بہاول پور سے کوئٹہ تک سفر کیا اور مسلسل ایک ہفتے تک ریل گاڑی میں قیام کیا اور ٹرین شہروں کی کوریج کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔

زمانہ طالب علمی سے ہی فنون لطیفہ سے متعلق ان کی تحاریر انگریزی اور اردو زبان کے مختلف قومی اخبارات و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے مضامین باقاعدگی سے ریڈیو پاکستان کے ماہنامہ جریدے "آہنگ" میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سجاد پرویز کا شمار پاکستان کی مقبول ترین ویب سائٹ "ہم سب" کے لیے مستقل لکھنے والوں میں بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے نشریاتی کیریئر کے دوران ریڈیو پاکستان بہاول پور اور اسلام آباد سے متعدد نئی آوازوں کو بھی متعارف کرایا۔ نشریات کی دنیا میں ان کی ایک اور انفرادیت زندگی کی مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی وہ نام ور شخصیات جو دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں، جن میں شعر و ادب، کھیل، موسیقی، اداکاری، مصوری، سائنس اور سیاست کے افق کے درخشندہ ستارے شامل ہیں، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اب تک تقریباً تین سو سے زائد مختصر دورانیے کے خصوصی تعزیتی پیکجز پروڈیوس کرنا ہے جو اُن شخصیات کے یوم وفات کے موقع پر ریڈیو پاکستان سے قومی نشریاتی رابطے پر روزانہ رات آٹھ بجے نشر ہونے والے "خبرنامہ" کا حصہ بنتے ہیں۔

شہزاد احمد خالد

ڈائریکٹر پریس، میڈیا اینڈ پبلیکیشنز

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

Printed by: The University Printing Press, IUB
Ph: # +92-62-9255598, E-mail: upp@iub.edu.pk